Registered No. L. 4186

جمادی الاولیٰ ۱۳۵۸ھ | جلد ۱۴ — عدد ۵

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" - لاہور

ملتان روڈ

قیمت سالانہ صہ

قیمت فی پرچہ ۸ر

تنقیحات

تنقیحات یہ مؤلف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم، اور اس سے پیدا شُدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مُسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب اِن سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اِن اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مُسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہیں۔

ضخامت ۰۴۲ صفحات۔ قیمت غیر مجلد ۱۲؍ مجلد عہ؍۔ علاوہ محصُولڈاک۔

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"۔ لاہور

[illegible] لاہور میں چھپی

فہرست مضامین

ماہ جمادی الاولی ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۳۹ء۔ جلد ۱۴۔ عدد ۵

باہتمام سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر وپبلشر گیلانی الکٹرک پریس لاہور میں طبع ہو کر

دفتر ترجمان القرآن ملتان روڈ لاہور سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

قوانین فطرت سب کے سب بلا استثناء دائمی، عالمگیر اور بے لاگ ہیں۔ ہوا آج سے لاکھوں برس پہلے جس قانون کی تابع تھی، اسی کی آج بھی ہے۔ اور اسی کی تابع قیامت تک رہیگی۔ زمانہ کے تغیرات کا اس پر کوئی اثر نہیں۔ روشنی اور حرارت کے لیے جو قانون دنیا کے ایک حصہ میں ہے وہی دوسرے حصہ میں بھی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا کہ مشرق میں حرارت کی ماہیت و کیفیت کچھ اور ہو اور مغرب میں کچھ اور، شمال میں روشنی ایک رفتار سے چلے اور جنوب میں دوسری رفتار سے۔ اشیاء کے بننے اور بگڑنے، بڑھنے اور گھٹنے، پیدا ہونے اور فنا ہو جانے کے لیے جو قوانین مقرر ہیں ان کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے۔ ان میں کوئی رو رعایت، کوئی لاگ لپیٹ، کوئی جانب داری نہیں پائی جاتی۔ فطرت کا کسی کے ساتھ کوئی ایسا رشتہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ وہ کسی کی دوست اور کسی کی دشمن نہیں۔ کسی پر مہربان اور کسی پر نامہربان نہیں۔ جو آگ میں ہاتھ ڈالیگا، جل جائیگا۔ جو زہر کھائیگا، مر جائیگا۔ جو غذا کھائیگا، قوت اور نشو و نما پائیگا۔ فطرت کے حدود فرمانروائی میں یہ ممکن نہیں کہ دیا سلائی کی رگڑ سے ایک کے لیے تو آگ کا شعلہ پیدا ہو اور دوسرے کے لیے پانی کی دھار۔

انسان جس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے وہ بھی اُسی فطرت کا ایک رخ ہے جو ساری کائنات پر

حاوی ہے۔ لہٰذا انسانی فطرت کے قوانین بھی فطرت کائنات کی طرح دائمی، عالمگیر اور بے لاگ ہیں۔ زمانہ کے تغیرات سے مظاہر میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو جائے، حقائق میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ علم اور وہم میں جو فرق آج سے دس ہزار برس پہلے تھا وہی آج بھی ہے اور قیامت تک رہیگا۔ ظلم اور عدل کی جو حقیقت دو ہزار برس قبل مسیح تھی وہی دو ہزار برس بعد مسیح بھی ہے۔ جو چیز حق ہے وہ چین میں بھی ویسی ہی حق ہے جیسی امریکہ میں ہے، اور جو چیز باطل ہے وہ کالے کے لیے بھی اسی طرح باطل ہے جس طرح گورے کے لیے ہے۔ انسان کی سعادت و شقاوت اور فلاح و خسران کے لیے فطرت کا قانون قطعاً بے لاگ ہے۔ اس میں کسی شخص، کسی قوم، کسی نسل کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ اسبابِ سعادت اور اسبابِ شقاوت سب کے لیے یکساں ہیں۔ جو شقاوت کے اسباب فراہم کریگا وہ محض اس بنا پر سعادت سے ہم کنار نہیں ہو سکتا کہ اسکا تعلق کسی خاص ملک یا نسل یا قوم سے ہے، اور اسی طرح جو سعادت کے اسباب فراہم کریگا وہ بھی محض اس بنا پر اپنے کسب کے ثمرات سے محروم نہ رکھا جائیگا کہ وہ فلاں نسل سے تعلق رکھتا ہے یا فلاں نام سے موسوم ہے۔

فطرت انسانی کے اس دائمی، عالمگیر اور بے لاگ قانون ہی کا دوسرا نام "اسلام" ہے۔ اسکو انسان پر منکشف کرنے والا وہی فاطر کائنات ہے جس نے انسان کی اور سارے جہان کی فطرت بنائی ہے۔ یہ کسی قوم پرست کا تخیل نہیں ہے جو ساری دنیا کو اپنی قوم کے مفاد و مصالح کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ کسی طبقاتی لیڈر کی پروازِ فکر بھی نہیں ہے جو سارے معاملات پر ایک طبقہ کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتا ہے۔ فی الجملہ یہ کسی انسان کے اجتہاد کا نتیجہ نہیں ہے کہ کسی خاص عہد کا، کسی خاص ماحول کا اور کسی خاص شخص یا گروہ کی دلچسپیوں کا مقید ہو۔ یہ تو درحقیقت ربُّ العٰلمین کی ہدایت سے ماخوذ ہے اور ربّ العٰلمین وہ ہے جس کی نگاہ میں سب انسان یکساں ہیں۔ وہ انسان کو انسان

کی حیثیت سے دیکھتا ہے نہ کہ جرمن اور اٹالین کی حیثیت سے یا مزدور اور سرمایہ دار کی حیثیت سے اس کو اشخاص اور اقوام سے دلچسپی نہیں بلکہ محض انسان سے ہے۔ اسلیے وہ دیانت، اخلاق اور مدنیت فاضلہ کے جتنے اصول بتاتا ہے وہ سب کے سب ہر قسم کی محدودیتوں سے پاک ہیں۔ ان میں بحیثیت مجموعی تمام انسانوں کی فلاح وبہبود اور زندگی کے ہر مرحلہ میں ان کی کامیابی مدنظر رکھی گئی ہے۔ وہ فطرت کے تمام دوسرے قوانین کی طرح عالمگیر ہیں۔ ان کا کسی شخص یا قوم کے ساتھ کوئی مخصوص رشتہ نہیں ہے جو کسی دوسرے شخص یا قوم کے ساتھ نہ ہو سکتا ہو۔ جو کوئی بھی ان اصولوں کو قبول کر کے ان کے مطابق عمل کریگا، فلاح پائیگا، خواہ وہ رومی ہو یا حبشی، آریہ نسل سے ہو یا سامی نسل سے، امریکہ میں رہتا ہو یا ایشیا میں۔ اور جو ان اصولوں سے انحراف کریگا، نقصان اٹھائیگا، خواہ وہ کسی پیغمبر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

ہم جب کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد سب سے پہلے اپنے وطن کو اور بالآخر تمام دنیا کو "دارالاسلام" بنانا ہے تو اس سے ایک ناواقف آدمی اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ جس طرح ہر جوشیلا قوم پرست زمین میں اپنی قوم کا غلبہ اور تمکّن چاہتا ہے، اسی طرح یہ لوگ بھی اپنی قوم کو غالب اور حکمراں دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی قوم میں پیدا ہوئے ہیں اس لیے "مسلمانوں کی حکومت" ان کا نصب العین بن گیا ہے۔ یہی ہندوؤں میں پیدا ہوئے ہوتے تو مونجے اور ساورکر بنتے۔ جرمنی میں پیدا ہوتے تو ہٹلر اور گویرنگ کے روپ میں نمودار ہوتے۔ کسی اطالوی کی آغوشِ محبت میں جنم لیتے تو مسولینی کی صورت اختیار کرتے۔

یہ غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ "دارالاسلام" کو "دارالمسلمین" کا ہم معنی سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ دونوں میں حقیقۃً بڑا فرق ہے۔ جو لوگ کلمہ گو ہونے کی وجہ سے دائرۂ اسلام

میں داخل ہیں، اور معاشرت کے اعتبار سے مسلمانوں میں شمار کیے جاتے ہیں وہ اگر غیر اسلامی طریقوں پر حکومت کریں، تو ان کی حکومت مسلمانوں کی حکومت تو ضرور کہلائیگی کہ اتفاق سے حکمران کلمہ گو ہیں، مگر ایسی حکومت اسلامی حکومت ہرگز نہ ہوگی اور نہ اس پر صحیح معنوں میں "دارالاسلام" کا اطلاق ہو سکے گا۔ حاشا وکلا، ہمارا نصب العین ایسی "مسلمان حکومت" کا قیام ہرگز نہیں ہے۔ اگر اس حیثیت سے ہم اپنی قوم کی بڑائی چاہیں، اور اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ محض فوجی طاقت سے مسند حکومت پر قبضہ کر کے زمین کی دولت اور فرمانروائی کے "تکبر" کو اپنی قوم کے لیے مخصوص کر لیں تو خود اسلام ہی سب سے پہلے آگے بڑھ کر ہم کو ظالم اور مفسد ٹھیرائیگا کیونکہ وہ صاف کہتا ہے کہ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا۔ "آخرت میں عزت کا مقام ہم نے صرف انہی لوگوں کے لیے رکھا ہے جو زمین پر اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کا ارادہ رکھتے ہیں"

درحقیقت جو چیز ہمارے پیش نظر ہے وہ مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ "اسلام کی حکومت" ہے، اُسی اسلام کی جو مجموعہ ہے دیانت، اخلاق اور مدنیت فاضلہ کے عالمگیر اصولوں کا۔ یہ اسلام ہماری یا کسی کے باپ دادا کی میراث نہیں ہے۔ اس کا کسی سے کوئی خاص رشتہ نہیں۔ جو ان اصولوں پر ایمان لائے اور اُن پر عمل کرے وہی اسلام کا علمبردار ہے۔ وہ اگر نسل کے اعتبار سے چمار یا جلاہا بھی ہو تو محمد رسول اللہ کی مسندِ خلافت پر بیٹھ سکتا ہے، وہ اگر نکٹا حبشی غلام بھی ہو تو عرب و عجم کے شرفا اور سادات کا امام بن سکتا ہے۔ ساڑھے تیرہ سو برس سے جن کے خاندان میں اسلام چلا آرہا ہے وہ اگر آج ان اصولوں سے منحرف ہو جائیں تو اسلام میں انکی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اور کل تک جو شخص ہندو یا عیسائی یا پارسی تھا، شرک اور بت پرستی، شراب اور سود اور قمار بازی میں مبتلا تھا، وہی اگر آج اسلام کی فطری صداقتوں کو مان کر ان کا پابند ہو جائے تو اسکے لیے اسلام میں عزت اور بزرگی کے اونچے سے اونچے مراتب تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔

جب کوئی شخص یا گروہ کسی مسلک کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ کر کے اس امر کا اطمینان حاصل کر لیتا ہے کہ اس میں انسانیت کی فلاح اور انسانی تعلقات و معاملات کی بہتری کمال درجہ پر موجود ہے تو اسکے اندر فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ جس اجتماعی زندگی سے خود اس کا تعلق ہے ، جس سوسائٹی کے ساتھ اسکی زندگی و موت والبتہ ہے ، جس طبقۂ انسانی کے ساتھ وہ تمدنی ، سیاسی اور معاشی تعلقات میں جکڑا ہوا ہے ، سب سے پہلے اسی کے نظام حیات کو اس مسلک کے مطابق بنانے کی کوشش کرے - اسے اپنے اس پسندیدہ مسلک کے صحیح و مفید ہونے کا جتنا زیادہ یقین ہوگا ، اور اسکے دل میں حُبِّ انسانیت یا حُبِّ وطن کا جذبہ جتنا زیادہ قوی ہوگا ، اتنا ہی زیادہ وہ اپنے ابنائے نوع یا ابنائے وطن کو اُس مسلکِ حق کے فوائد سے بہرہ مند کرنے کے لیے بے چین ہوگا جس میں وہ انکی فلاح و بہبود اور کامرانی و خوشحالی مضمر دیکھتا ہے ، اور اتنا ہی زیادہ شدت کے ساتھ وہ ان مسلکوں کی حکمرانی کا مخالف ہوگا جن کو وہ پورے یقین کے ساتھ غلط اور نقصان دہ سمجھتا ہے - یہ عین انسانی فطرت کا مقتضا ہے اور اس میں کوئی بات خلاف حب وطن (Unpatriotic) نہیں ہے - بلکہ خلاف حب وطن تو یہ بات ہے کہ آدمی جس مسلک کو ایمانداری کے ساتھ موجب فلاح سمجھتا ہو اس کو خاموشی کے ساتھ اپنے دل میں یا اپنے گھر میں لیے بیٹھا رہے اور جن طریقوں کو وہ ایمانداری کے ساتھ نقصان رساں سمجھتا ہو انہیں اپنے ابنائے وطن کی زندگی پر مسلط ہونے دے -

---

جن لوگوں نے مغرب کے جمہوری نظام کا مطالعہ کیا اور اسے اپنے نزدیک برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے نظام تمدن کو اسی نمونہ پر ڈھالیں - جن لوگوں نے سوشلزم کا مطالعہ کیا اور اسے برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کی اجتماعی تعمیرِ نو

(Social reconstruction) اسی طریقہ پر ہو- یہ آخر کیوں ہے؟ کیا اس کے لیے کوئی حجت اس کے سوا پیش کی جا سکتی ہے کہ انکے ایمان و اعتقاد کا مقتضیٰ یہی ہے؟ کیا ان کے اس اقدام کو کوئی شخص خلاف حب وطن یا خلاف حب انسانیت کہہ سکتا ہے؟ کیا ان کے حق میں یہ راستبازی ہوگی کہ وہ جس مسلک کو اپنے ابنائے جنس کے لیے سعادت و فلاح کا ذریعہ سمجھتے ہیں اسکے لیے کوئی جد و جہد نہ کریں اور کسی ایسے نظام زندگی کی حکمرانی کو گوارا کریں جو انکے نزدیک باشندگان ملک کو پستی اور بدحالی کی طرف لے جانے والا ہو؟ اگر بالفرض ملک کی آزادی اور اقوام عالم کے درمیان اہل وطن کی عزت بڑھنے کا امکان کسی شخصی استبدادی حکومت کے قیام اور سرمایہ دارانہ نظام کے بقا ہی میں ہو، تو کیا کسی سچے جمہوریت پسند اور کسی راستباز اشتراکی سے آزادی اور وطنی عزت کے نام پر اپیل کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے اپنے مسلکوں کو چھوڑ کر اس طریقہ کو قبول کریں؟ اور کیا یہ دونوں اس اپیل کو سن کر واقعی ہتھیار ڈال دینگے؟

ہم کو جو چیز "دارالاسلام" کی صدا بلند کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جو دوسرے لوگوں کو "جمہوریت" اور "اشتراکیت" کے نعرے بلند کرنے پر مجبور کر رہی ہے- ہم نے برسوں اسلام کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ کیا- ہم نے اس کی اعتقادی اساس، اس کے نظریۂ حیات، اس کے اصول اخلاق، اس کے نظام تمدن، اس کے قوانین معاشرت و معیشت، اسکے آئین سیاست و طرز حکومت، غرض اسکی ایک ایک چیز کو جانچا اور پرکھا- ہم نے دنیا کے دوسرے اجتماعی نظریات اور تمدنی مسلکوں کو بھی کھنگال کر دیکھا اور اسلام سے ان کا تقابل کیا- اس تمام مطالعہ اور تحقیق و تنقید نے ہمیں اس امر پر پوری طرح مطمئن کر دیا کہ انسان کے لیے حقیقی فلاح و سعادت اگر کسی مسلک میں ہے تو وہ صرف اسلام ہے- اس کے مقابلہ میں ہر مسلک ناقص ہے- کسی دوسرے مسلک کی

اخلاقی اساس صالح اور مستحکم نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں انسان کی شخصیت کے ارتقار (Development of personality) کا پورا موقع نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں اجتماعی عدل (Social justice) اور بین الانسانی تعلقات کا صحیح توازن (Balance) نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں فطرت انسانی کے تمام پہلوؤں کی متناسب رعایت نہیں۔ اسلام کے سوا کوئی مسلک دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے جو انسان کو حقیقی آزادی سے ہم کنار کرتا ہو، اسے عزت کے بلندترین مدارج کی طرف لے جاتا ہو، اور ایک ایسا اجتماعی ماحول پیدا کرتا ہو جس میں ہر شخص اپنی قوت واستعداد (Capacity) کے مطابق اخلاقی روحانی اور مادّی ترقی کے انتہائی مدارج تک پہنچ سکے اور ساتھ ہی اپنے دوسرے ابنائے جنس کے لیے بھی ایسی ہی ترقی میں مددگار ہو۔

یہ اطمینان اور یقین حاصل ہو جانے کے بعد ہمارے لیے راستبازی کا تقاضا کیا ہے؟ کیا بالکل وہی نہیں جو ہمارے جمہوریت پسند یا اشتراکیت پسند ابنائے جنس کے لیے ہے؟ جس مسلک اجتماعی کو ہم پوری دیانت کے ساتھ انسانیت کے لیے رحمت سمجھتے ہیں، کیا ہم پر یہ فرض عائد نہیں ہو جاتا کہ اپنے ملک اور اپنے ابنائے نوع کی اجتماعی زندگی کو اسی مسلک کے مطابق منظم کرنے کی جدوجہد کریں؟ جو چیز جمہوریت پسندوں اور اشتراکیت پسندوں کے لیے حق ہے وہ ہمارے لیے کیوں غیر حق ہے؟

اسلام کے متعلق ہماری یہ رائے کچھ اس وجہ سے نہیں کہ ہم مسلمان گھر میں پیدا ہوئے ہیں، اور اسلام کے حق میں ایک طرح کا پیدائشی میلان رکھتے ہیں۔ اپنے دوسرے رفقار کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا کیا حال ہے، مگر اپنی ذات کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کو جس صورت پر میں نے اپنے گردوپیش کی مسلم سوسائیٹی میں پایا، میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی۔ تنقید و تحقیق کی صلاحیت

پیدا ہونے کے بعد پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہی تھا کہ اس بے روح مذہبیت کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا جو مجھے میراث میں ملی تھی۔ اگر اسلام صرف اسی مذہب کا نام ہوتا جو اس وقت مسلمانوں میں پایا جاتا ہے تو شاید میں بھی آج ملحدوں اور لامذہبوں میں جا ملا ہوتا، کیونکہ میرے اندر نازی فلسفہ کی طرف کوئی میلان نہیں ہے کہ محض حیات قومی کی خاطر اجداد پرستی کے چکر میں پڑا رہوں۔ لیکن جس چیز نے مجھے الحاد کی راہ پر جانے یا کسی دوسرے اجتماعی مسلک کو قبول کرنے سے روکا اور از سرِ نو مسلمان بنایا وہ قرآن اور سیرت محمدی کا مطالعہ تھا۔ اس نے مجھے انسانیت کی اصلی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ اس نے آزادی کے اس تصور سے مجھے روشناس کیا جس کی بلندی تک دنیا کے کسی بڑے سے بڑے لبرل اور انقلابی کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اس نے انفرادی حسنِ سیرت اور اجتماعی عدل کا ایک ایسا نقشہ میرے سامنے پیش کیا جس سے بہتر کوئی نقشہ میں نے نہیں دیکھا۔ اس کے تجویز کردہ لائحۂ زندگی (Scheme of life) میں مجھے ویسا ہی کمال درجہ کا توازن (Balance) نظر آیا جیسا کہ ایک سالمہ (Atom) کی بندش سے لے کر اجرام فلکی کے قانون جذب وکشش تک ساری کائنات کے نظم میں پایا جاتا ہے اور اسی چیز نے مجھے قائل کر دیا کہ یہ نظام اسلامی بھی اسی حکیم کا بنایا ہوا ہے جس نے اس جہان ارض و سما کو عدل اور حق کے ساتھ بنایا ہے۔

پس میں درحقیقت ایک نومسلم ہوں۔ خوب جانچ کر اور پرکھ کر اس مسلک پر ایمان لایا ہوں جس کے متعلق میرے دل اور دماغ نے گواہی دی ہے کہ انسان کے لیے صلاح و فلاح کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے۔ میں صرف غیر مسلموں ہی کو نہیں بلکہ خود مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اس دعوت سے میرا مقصد اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کو باقی رکھنا اور بڑھانا نہیں ہے جو خود بھی اسلام کی راہ سے بہت دور ہٹ گئی ہے، بلکہ یہ دعوت اس بات کی طرف ہے کہ آؤ

ہم اس ظلم اور طغیان کو ختم کردیں جو دنیا میں پھیلا ہوا ہے، انسان پر انسان کی خدائی کو مٹادیں اور قرآن کے نقشہ پر ایک نئی دنیا بنائیں جس میں انسان کے لیے بحیثیت انسان کے شرف اور عزت ہو، حریت اور مساوات ہو، عدل اور احسان ہو۔

بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان میں حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کرلی ہے جس کی وجہ سے اسلام کی تبلیغ کا نام سنتے ہی ایک شخص کا ذہن فوراً ووٹ بڑھانے کی کوشش اور سیاسی غلبہ (Domination) کی خواہش اور اسی قبیل کی بہت سی دوسری چیزوں کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ ایک طرف جمہوری طرز حکومت کے قیام نے سیاسی طاقت اور اس کے تمام ضمنی فوائد کو ووٹوں کی کثرت پر منحصر کردیا ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کی پوزیشن یہاں کچھ ایسی ہے کہ ان کی جانب سے اپنے مسلک کو پھیلانے کی کوئی کوشش اس شبہ سے نہیں بچ سکتی کہ یہ حوصلہ مند Ambitious) قوم اب اس راستہ سے سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ان شبہات کو قوت پہنچانے میں خود مسلمانوں کا اپنا بھی کافی حصہ ہے۔ ان کے بہت سے غلط نمائندوں نے تبلیغ تبلیغ کا شور کچھ اس طرح بلند کیا کہ گویا یہ محض ایک سیاسی حربہ ہے جسے اس جمہوری دور میں صرف اس غرض کے لیے استعمال کرنا چاہیے کہ اپنی قلت تعداد کے پیچیدہ مسئلہ کو حل کیا جائے۔ اس چیز نے اسلام کے راستہ میں ایک شدید قسم کا سیاسی تعصب حائل کردیا ہے۔ سوشلزم، کمیونزم، فاشزم یا اور کسی ازم کی تبلیغ کی جائے تو لوگ اسکو محض اس کے ذاتی اوصاف (Merits) کے لحاظ سے دیکھتے ہیں اور اگر ان کے دماغ کو وہ اپیل کرتا ہے تو اسے قبول کرلیتے ہیں۔ مگر اسلام ازم کا نام آتے ہی لوگوں کا ذہن اس طرف منتقل ہوجاتا ہے کہ یہ ہمارے ملک کی ایک ایسی قوم کا مسلک ہے جو پہلے یہاں حکومت کرچکی ہے اور اب اس جمہوری دور میں قلیل التعداد ہونے کی وجہ سے اپنے ووٹ بڑھانا چاہتی ہے

تاکہ نمائندہ مجالس کی نشستوں اور دفتری ملازمت کی کرسیوں پر قبضہ کرے۔ یہ خیال آتے ہی دل و دماغ پر قومی تعصب کے قفل چڑھ جاتے ہیں اور ذاتی اوصاف کے لحاظ سے جانچنے پرکھنے کا سوال ہی خارج از بحث ہو جاتا ہے۔

ہمیں ان حالات کا بڑے صبر کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑیگا۔ نیکی اور صداقت کی راہ میں ہمیشہ مشکلات حائل ہوتی ہی رہی ہیں۔ شیطانی راہیں آسان ہوتی ہیں اور حق کی راہ بہر حال موانع سے لبریز رہتی ہے۔ محض صبر، لگاتار سعی اور خالصتہً لوجہ اللہ کام کرنے سے ہم مسلمانوں کے دل بھی بدل سکتے ہیں اور غیر مسلموں کے دل بھی۔ جب ہماری سعی و جہد میں خدا کی خوشنودی اور بنی نوع انسان کی خیر خواہی کے سوا کسی دنیوی غرض کا شائبہ تک نہ ہوگا تو لوگوں کے دل خود بخود اس حقیقت کا ادراک کرنے کے لیے تیار ہو جائینگے کہ اسلام کسی نسل یا قوم کی میراث نہیں ہے بلکہ ایک انسانی مسلک ہے جس کا تعلق تمام انسانوں سے ویسا ہی عام ہے جیسا ہوا اور پانی کا تعلق سب سے ہے۔ اس میں ہر انسان دوسرے انسان کے ساتھ برابر کا شریک ہو سکتا ہے۔ یہ جس طرح مسلمانوں کی چیز ہے اُسی طرح تمہاری چیز بھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ اگر نیکی اور تقویٰ اور قانونِ الٰہی کی اطاعت میں تم نسلی مسلمانوں سے بڑھ جاؤ تو امامت تم کو ملیگی، تقدم اور شرف تمکو حاصل ہوگا، خلافت کے امین تم ہوگے اور نسلی مسلمان پیچھے رہ جائینگے۔ یہاں برہمنیت یا نسل پرستی نہیں ہے کہ عزت و شرف اور قوت و اقتدار پر کسی خاص گروہ کا دوامی اجارہ ہو۔ یہاں ایک قوم پر دوسری قوم کے غلبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تبلیغ اسلام کی نوعیت اچھوت ادھار کی سی نہیں ہے کہ ایک قوم محض دوسری قوم کے ووٹ بڑھانے کے لیے اس کی جز بنائی جائے مگر زندگی کی متاع میں اسکو برابر کا حصہ نہ دیا جائے۔ اسلام میں تو برابری نہیں بلکہ اپنے اوصاف ذاتی کے لحاظ سے زیادہ کا حصہ دار بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں پیدائش کی وجہ سے

آدمی اور آدمی میں کوئی امتیاز نہیں۔ کسی شخص کی راہ میں اسکے نسب یا اسکے پیشے یا اسکی قومیت کی وجہ سے کوئی رکاوٹ حائل نہیں۔ تم اپنے کیرکٹر اور اپنے کردار کے زور سے جہاں تک اڑنے کی طاقت رکھتے ہو اڑ سکتے ہو۔ فرش سے عرش تک تمہاری ترقی کی راہ میں کوئی روک نہیں۔

جو لوگ دور سے کسی چیز کو محض سرسری نظر ہی سے دیکھ کر رائے قائم کر لیتے ہیں انکی رائے عموماً غلط ہوا کرتی ہے۔ ایسی ہی غلطی وہ لوگ کر رہے ہیں جنہوں نے قرآن کا غائر مطالعہ نہیں کیا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر تحقیقی نظر نہیں ڈالی، اور محض پہلے سے قائم کردہ مفروضات کی بنا پر فیصلہ کر دیا کہ اسلام اب سے ۱۳ سو برس پہلے کی ایک مذہبی تحریک تھی جو اس زمانہ کے مخصوص تمدنی حالات میں تو بلاشبہ مفید ثابت ہوئی مگر اب حالات بہت بدل چکے ہیں، اس زمانہ کے حالات میں وہ پرانا مسلک کچھ فائدہ مند ثابت نہ ہوگا۔ اس غلط فہمی کے پیدا ہونے اور جڑ پکڑنے میں خود مسلمانوں کے اپنے طرزِ عمل کا بھی بہت کچھ دخل ہے۔ انہوں نے خود بھی اسلام کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور اسو ایک تحریک (Movement) کے بجائے محض زمانۂ سلف کی ایک مقدس میراث بنا کر رکھ دیا۔

اگر ایک سلیم الفطرت آدمی اپنے ذہن سے تاریخی اور سیاسی تعصبات اور پیشگی مفروضات کو نکال کر اسلام کا سائنٹفک مطالعہ کریگا تو اس پر یہ حقیقت خود بخود منکشف ہو جائیگی کہ اسلام کسی خاص زمانے کی مذہبی تحریک نہیں ہے جس کی بنیاد وقتی اور مکانی حالات پر ہو۔ بلکہ یہ ایسے اصولوں کا مجموعہ ہے جو انسانی فطرت کے حقائق پر مبنی ہیں اور عام قوانین فطری کے ساتھ کامل موافقت (Harmony) رکھتے ہیں۔ انسان کے حالات اور خیالات خواہ کتنے ہی بدل جائیں، مگر اسکی فطرت ہر حال میں جوں کی توں رہتی ہے۔ زمانہ خواہ کتنے ہی پلٹے کھائے،

بہر حال کائنات فطرت کے حقائق اور قوانین میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو فطری اصول طوفان نوح کے وقت انسانی زندگی کے لیے مفید تھے وہی اس بیسویں صدی عیسوی میں بھی مفید ہیں، اور وہی ننشہ عیسوی میں بھی منزل سعادت کی طرف انسان کی رہنمائی کے لیے کافی ہونگے۔ تغیر جو کچھ بھی ہوگا ان فطری اصولوں میں نہیں بلکہ بدلنے والے حالات پر ان کے انطباق (Application) میں ہوگا۔ اسلام کی اصطلاح میں اس کا نام اجتہاد ہے، یعنی اصولوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر قانون کی اسپرٹ کے مطابق نئے حالات پر منطبق کرنا۔ اور یہ اجتہاد ہی وہ چیز ہے جو نظام اسلامی کو ایک محرک و متحرک (Dynamic) نظام بناتا ہے اور اسکے قوانین کو حالات و ضروریات کے مطابق مرتب (Adjust) کرتا رہتا ہے۔

اسلامی قانون اور نظامِ معاشرت

ترجمہ مولوی ابونصر محمدؐ خالدی صاحب

[یہ اس مضمون کا ترجمہ ہے جو کتاب (Legacy of Islam) میں پروفیسر سانتی لان (David D. Santillane) نے لکھا ہے۔ صاحب موصوف روم کی یونیورسٹی میں دین اسلام کی تنظیمات کے پروفیسر ہیں۔

یہ پوری کتاب اس نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے کہ اسلام گویا زمانۂ ماضی کی ایک چیز ہے۔ ایک مردہ تہذیب ہے جو زمانۂ حال کی تہذیب کے لیے کچھ آثار چھوڑ گئی ہے۔ اسی لیے اس کا نام اسلام کا "ترکہ" رکھا گیا ہے۔

پروفیسر سانتی لان کے اس مضمون میں مغربی ذہنیت نمایاں ہے۔ وہ اسلام کے قوانین معاشرت وتمدن کو اور خود اسلام کو پرانی سامی اقوام کے مذہبی وتمدنی تصورات ونظامات کی ایک اصلاح یافتہ صورت سمجھتے ہیں اور اسکی بنیادوں کا سراغ پچھلی تاریخ میں لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاہم حقیقت انکی پردہ پوشی کے باوجود نمایاں ہو کر رہی ہے۔ ہم نے جگہ جگہ اپنے حواشی میں انکی غلطیوں پر تنبیہ کردی ہے۔ - ایڈیٹر]

عرب قدیم کے معاشرتی نظام کی بنیاد خونی رشتہ پر تھی۔ ایک ہی جد کی اولاد یا کم سے کم ایک ہی جد کی اولاد ہونے کا دعوی کرنے والے انسانوں کا ایک گروہ باہمی دفاع کے لیے آپس میں متحد ہوا کرتا تھا۔ اس گروہ کے افراد مشترک طریق عبادت اور مشترک رسوم کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوا

کرتے تھے، مگر سب سے مقدم اور سب سے اہم چیز جو ایک مؤثر برادری پیدا کرتی تھی، وہ یہی خونی رشتہ تھا، خواہ حقیقی ہو یا فرضی۔ عرب قبیلہ درحقیقت ایک بڑا خاندان ہوتا تھا۔

تمام قدیم معاشروں کی طرح عرب میں بھی نظام معاشرت کے اجزائے ترکیبی افراد نہیں بلکہ افراد کے مجموعے ہوتے تھے۔ فرد بجائے خود زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کی اہمیت اس خاندان یا جماعت کی وجہ سے ہوتی تھی جس سے اس کا تعلق ہوتا تھا۔ خاندان ہی اپنے معاشرتی اور قانونی نظریوں کے تحت اپنے تمام افراد کی زندگیوں کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھتا تھا۔ خاندان ہی اپنے افراد کے حقوق کا دعویٰ کرتا، ان کے نقصانات کا بدلہ لیتا، ان کی غلطیوں کا جواب دہ ہوتا، ان کی موت کے بعد ان کی جائداد کا مالک ہوتا اور یہ سب اسی سنت کے مطابق ہوتا تھا جس کا تمام قابل لحاظ اقتدار قدیم ترین زمانے سے چلے آنے والے رواج سے ماخوذ تھا۔

اسلام نے اس نظام کو اس کی تمام ضروری خصوصیات کے ساتھ باقی رکھا۔ اس نے صرف ایک عنصر تبدیل کیا یعنی عرب قبیلہ کی سیاسی و معاشرتی بنیاد ـــــــ خونی رشتہ کو عقیدے کی جماعت میں تبدیل کر دیا۔

قدیم سامی قبیلوں میں پہلے ہی سے عبادت قبائلی زندگی کا مرکز تھی۔ ایک قبیلہ کسی مخصوص بت کو اپنا معبود بنا لیتا تھا اور یہ بت ہی قبیلہ اور قرابت کے تسلسل کی تعیین اور تشخص کا باعث ہوتا تھا۔ قدیم سامیوں کے ہاں کسی بت کی تبدیلی وہی معنی رکھتی تھی جو ہمارے ہاں قوم کی تبدیلی کے ہیں۔

اس طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عرب معاشرے کو اس کی قدیم ابتدائی بنیاد پر صرف دوبارہ قائم کر دیا[1] اور اس پر ایسی معاشرتی عمارت تعمیر کر دی جو اس کے عمیق ترین طبعی جذبے کے مناسب تھی۔ یہ

---

[1] مصنف یہاں حقیقت کو مسخ کر رہا ہے۔ آنحضرت نے دراصل تمام الٰہوں کی نفی کر کے اور صرف ایک الٰہ (یعنی اللہ) کو واحد معبود قرار دے کر اس بنیاد ہی کو ڈھا دیا جس پر قبائل اور قوموں کا جداگانہ تشخص قائم تھا۔ آپ نے ایک ایسا نظام معاشرت تعمیر کیا (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶ پر دیکھئے)

حقیقت ابنِ خلدون کی بالغ نظری سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ خاندان اور قبیلے کا ڈھانچہ منہدم کر دیا گیا اسلیے سرداری یا قبائلی عہدیت کا کوئی سوال باقی نہیں رہا تھا۔ جو شخص اسلام قبول کرتا اس کو تمام تعلقات حتیٰ کہ اپنے رشتوں ناطوں کو بھی بھول جانا پڑتا تھا اِلّا یہ کہ وہ اس کے دینی بھائی ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام کی طرح اس کو خاص اپنے لوگوں سے، جب تک وہ اپنے عقیدے کے پابند رہیں، یہ کہنا پڑتا کہ "میں نے اپنا منہ پھیر لیا ہے اور میں مشرکوں میں نہیں ہوں" اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۔ یہ تھیں پیغمبر (صلعم) کے تیار کیے ہوئے معاشری نظام کی خصوصیات۔

اس اجتماعیت کی گم کردگی سے ہم انفرادیت ابھرتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ اسلام کے بعد سے انسان کا شمار بحیثیت فرد ہونے لگا۔ اب وہ فرائض و حقوق، کسی قوم سے تعلق ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے عقائد کی وجہ سے حاصل کرتا ہے۔ "امت اسلامیہ" کی تشکیل ایسے ایک ہی قسم کے عقائد رکھنے والے لوگوں سے ہوتی ہے۔

توحید خداوندی و رسالت محمدی پر ایمان لانے والوں اور پیغمبر کے تعلیم کیے ہوئے چند عقائد کو

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵ - جو قبائلی کثرت کی جگہ اعتقادی وحدت پر مبنی تھا مصنف اس عظیم الشان کام کو لفظ "صرف" کے ساتھ بیان کر کے اسکی اہمیت گھٹانا چاہتا ہے۔ مگر کسی صاحب نظر آدمی سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ جن لوگوں کو صدیوں سے الگ الگ خداؤں کی عبودیت نے تقسیم کر رکھا ہو، اور جنکے جذبات، خیالات اور تمدن و معاشرت میں صدہا برس کے توارث نے شرک کے ان اثرات کو گہری جڑوں کے ساتھ جما رکھا ہو، ان کو ایک اللہ کی بندگی پر جمع کرنا، قومی و نسلی تعصبات اور معاشرتی تقسیم کی دیواروں کو توڑ کر انہیں ایک کر دینا، اور ان کے جذبات و افکار کی دنیا کو بدل ڈالنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ یہ دراصل تاریخ کی رفتار کو بدلنا اور ایک نئی تاریخ بنانا تھا۔ ایک اکیلے شخص کا ۲۳ سال کی مدت میں ایسا زبردست انقلاب برپا کرنا درحقیقت انسانی تاریخ میں ایک نادر واقعہ ہے۔ ترجمان القرآن

قبول کرنے والوں کو امت اسلامیہ سے رشتہ جوڑنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اس نئی قسم کی امت نے اس قدیم قومیت یا قبیلے کی جگہ لے لی جس کی بنیاد خونی رشتہ پر تھی۔ یہ امت دوسری تمام جماعتوں سے مختلف ہے۔ "یہ بہترین امت ہے کہ نیکی پھیلانے اور بدی کو روکنے کا کام اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ روئے زمین پر حقیقی انصاف اسی کے پاس ہے ــــ اور جس طرح رسول مسلمانوں پر خدا کی طرف سے شاہد ہیں اُسی طرح مسلمان تمام قوموں پر خدا کی طرف سے شاہد ہیں"۔

یہ سب خیالات اسلام کی قدیم ترین تاریخی دستاویز یعنی اس فرمان خداوندی (قرآن) میں پیش کیے گئے ہیں جس کا نزول سنہ ہجری میں مدینۃ النبی میں ہوا۔[1]

امت اسلامیہ گویا ایک بڑا خاندان ہے جو ہر اس جماعت سے مقابلہ کے لیے تیار ہے جو خدائے واحد کو نہیں پوجتی۔ "ایک ہاتھ سب کے خلاف" جیسا کہ ابوبکرؓ نے اہل مدینہ کو خطاب کر کے کہا۔ "اسلام میں ہمارے بھائی غنیمت میں ہمارے شریک اور دشمنوں کے خلاف ہمارے مددگار" اس پورے نظام ملت کے مذہبی اخلاق کی خصوصیت یہ ہے کہ ضرورت کے وقت ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کی امداد وحفاظت کا حکم دیا گیا ہے اور باہمی امداد و اعانت قانونی فریضہ خیال کی گئی ہے۔ حدیث میں ہے کہ "ایک مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت کے مانند ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے کو تقویت دیتا ہے"۔ یہ خیالات اسلامی قانون کے ہر حصے میں مل سکتے ہیں خواہ وہ اجتماعی ہوں یا انفرادی۔ برادری کا لازمی نتیجہ مساوات ہے۔ جس طرح سب مسلمان اللہ کے ہاں برابر ہیں اسی طرح آپس میں بھی مساوی حیثیت رکھتے ہیں مسلمانوں میں برتری صرف سبقت اسلام پر قایم ہوتی ہے یا احکام الٰہی کی مکمل اطاعت پر۔ "اے قریش اللہ نے تم سے نسب کے فخر اور جاہلیت کے غرور کو دور کر دیا ہے۔ تمام انسانوں کے باپ آدم تھے اور آدم کو اللہ نے مٹی سے بنایا ہے"۔ سیاسی وکشوری (Civil) دونوں قسم

[1] یہ غلط ہے۔ قرآن کا نزول سنہ ہجری کے آغاز سے ۱۳ برس پہلے مکہ میں شروع ہوا تھا۔ ترجمان القرآن

کے قانون میں مکمل مساوات اس پورے نظام کی اصل بنیاد ہے۔ عمرؓ نے ابوموسیٰ اشعری کو جو مشہور ہدایتیں دی ہیں ان میں ہے کہ "لوگوں کو اپنے حضور میں، اپنی مجلس میں اور اپنے انصاف میں برابر رکھو تاکہ کمزور انصاف سے مایوس نہ ہوں اور نہ قوی تمہاری رعایت کی امید رکھیں" یہ ہدایت نامہ مستند ہو یا نہ ہو لیکن یہ باتیں اصول قانون کی ہر ابتدائی کتاب میں مذکور ہیں اور دیوانی قانون اور دوسرے ہر قسم کے معاملات کی بنیاد ہیں۔

قدیم اسرائیلی دینی بھائیوں کی طرح[1] مساویانہ حیثیت رکھنے والے افراد کی اس ملت کا پادشاہ خود خدا ہے اور وہ اپنے بندوں پر بلاواسطہ اور راست حکومت کرتا ہے۔ قدیم عرب قبائل کے بت اپنے پجاریوں کے محافظ و مربی خیال کیے جاتے تھے۔ اپنے بہترین بندوں کا حامی و ناصر "اللہ" اب قدیم بتوں کی جگہ لے لیتا ہے اور ملت اسلامیہ پر حکومت کرتا ہے۔ ایک قبیلہ کے سردار نے جب اسلام قبول کر کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہا کہ "آپ ہمارے آقا ہیں" تو آپ نے فوراً ارشاد فرمایا کہ "آقا اللہ ہے میں نہیں ہوں"۔ اسلام اللہ کی راست حکومت ہی کا دوسرا نام ہے، ایسے اللہ کی حکومت جو اپنے بندوں کا ہر طرح نگراں ہے۔ اصول تنظیم و تعاون جو دوسرے معاشروں میں مملکت کہلاتی ہے، اسلام میں وہ اللہ کی ذات ہے۔ یعنی انتہائی اور آخری قوت مقتدرہ ہی کا دوسرا نام اللہ ہے جس کی ربوبیت مفاد عامہ کے لیے ہوتی ہے۔ حکومت کا خزانہ اللہ کا خزانہ ہے۔ فوج اللہ کی فوج ہے۔ حتیٰ کہ حکومت کے عہدیدار بھی اللہ کے عامل ہیں۔

---

[1] یہاں پھر مصنف اسلام کا رشتہ قدیم سامی تخیلات سے جوڑنا چاہتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر رہا ہے کہ بنی اسرائیل خدا کو صرف بنی اسرائیل کا خدا سمجھتے تھے۔ اور اسلام میں خدا رب العالمین ہے۔ اسرائیلیوں کے دینی بھائی صرف اسرائیلی تھے مسلمانوں کا دینی بھائی ہر انسان ہے جو رب العالمین کی بندگی و اطاعت میں ان کے ساتھ شریک ہو۔ اسلام کا خدا (Tribal deity) نہیں ہے۔ - ترجمان القرآن

ایک فردِ مسلم اور اللہ کا تعلق بھی اس سے کچھ کم راست نہیں ہے۔ اللہ اور مسلمان کے درمیان کوئی وسیلہ یا واسطہ نہیں ہوتا۔ اسلام میں کلیسا، پادری یا اصطباغ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ انسان اور اس کے خالق کے درمیان کسی واسطے کی ضرورت ہی کیا ہے جب کہ وہ اس کو اس کی پیدائش کے پہلے ہی سے جانتا ہے اور اپنے بندہ کی "شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے"۔ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بنی نوع انسان کو اللہ کا آخری پیام پہنچا دیا ہے۔ اب بندوں کو اللہ کی مرضی سے واقف کرانے کے لیے نہ کسی شارح کی ضرورت ہے اور نہ کسی نائب کی ہے۔ اللہ کے سامنے انسان موت و حیات دونوں حالتوں میں اپنا آپ ذمہ دار ہے۔ جس طرح ایک عرب بیدھے سادھے طریقہ سے اپنے سردار کو مخاطب کر سکتا ہے اسی طرح ایک انسان بغیر کسی تعارف یا رسم کے اللہ کو بھی راست مخاطب کر سکتا ہے۔ پیدائش سے موت تک، بلکہ پیدائش سے پہلے اور موت کے بعد تک بھی انسان اللہ کے روبرو رہتا ہے کیونکہ اللہ کی نظر سے کوئی چیز نہیں چھپ سکتی، حتی کہ انتہائی پوشیدہ خیال بھی اس کے لیے ظاہر و آشکارا ہے۔ انسان اپنے اعمال کا آپ ہی تنہا جواب دہ ہے۔ اللہ کا فیصلہ تنہا اسی کو برداشت کرنا پڑے گا اور قیامت کے دن جب تمام مخلوق اپنے اعمال کا بدلہ حاصل کرنے کے لیے بلائی جائیگی اس وقت اللہ کے آگے کسی کو کسی کا وسیلہ کام نہ دیگا اور نہ کسی کی شفاعت سود مند ہوگی۔ انتہائی سخت پروٹسٹنٹ مذہب بھی اس شخصی توحید پرستی کے مقابلہ میں ایک پروہتی مذہب قرار پاتا ہے کیونکہ یہ انسان اور اس کے خالق کے درمیان کسی قسم کی مداخلت حتیٰ کہ مداخلت کے رجحان کو بھی روا نہیں رکھتا۔

بے یار و مددگار انسان علیم و خبیر خدا کی گرفت سے محفوظ و مامون رہنے کے لیے کیا کر سکتا ہے بجز اس کے کہ وہ اپنے آپ کو اسی کے سپرد کر دے اور اس کے غضب سے بچنے کے لیے اسی کے دامن رحم میں پناہ ڈھونڈے۔ اسی لیے اسلام کہتا ہے اللہ سے اللہ ہی کی طرف رجوع کرو (اللہم

(انی اعوذ بک منک) حقیقی دین یہ ہے کہ اللہ کے آگے انسان اپنے آپ کو عاجزی کے ساتھ سپرد کردے اور مایوس نہ ہو بلکہ ہمیشہ اسکی عنایات کا امیدوار رہے ۔ اسی وجہ سے "اسلام" یعنی کسی شخص کا اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کے سپرد کردینا ہی سچا مذہب ہے کیونکہ اللہ کے مقابلہ میں مذہبی روح کا کوئی اقتضا اس کے سوا نہیں ہے ۔ اس طرح اللہ کے مقابلہ میں انسان کو اپنے عجز اور اس کی قدرت کی یافت ہوجاتی ہے ۔ یہی مکمل تسلیم، جو اکثر سامیت[1] کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے، اسلام کی خاص علامت اور دوسری قوموں میں اس کا امتیازی نشان ہے ۔ خاص اپنی قوم کے مذہبی رجحان کے ساتھ اس تعلیم کی ہم آہنگی کے موہوم شعور نے شاید پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ اعلان کرنے پر آمادہ کیا کہ آپ خاتم النبیین اور خالص و اصلی دین ابراہیمی کے احیا کنندہ ہیں[2] ۔

---

[1] پیغمبروں کی تعلیم سے قطع نظر کرکے اگر دیکھا جائے تو سامیت کی کوئی خصوصیت اسکے سوا نظر نہیں آتی کہ ہر سامی قبیلہ خدا کے ساتھ اپنا خصوصی رشتہ جوڑتا ہے، اپنے آپ کو "ابناء اللہ واحباءہ" سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ ہم خواہ کتنی ہی نافرمانیاں کریں، ہمارے بزرگ ہمکو خدا کے غضب میں گرفتار ہونے سے بچالینگے ۔ اسی قسم کے تخیلات یہودیوں میں تھے، اور یہی تخیل کفارہ کی صورت میں عیسائیوں کے اندر موجود ہے ۔ اسلام کو اس "سامیت" سے کیا واسطہ؟ مگر یہ بیچارہ یورپین دماغ! اس کی پرورش ہی کچھ اس طور پر ہوئی ہے کہ یہ انسان کو تاریخی قوتوں کا غلام سمجھتا ہے اور انقلاب تاریخ کے تصور سے عاجز ہے ۔ اس غریب کی سمجھ میں یہ بات کہاں آسکتی ہے کہ خدا کا پیغمبر تاریخ بدلنے آتا ہے اور تاریخی قوتوں کا زور توڑ کر ایک نئی تاریخ بناتا ہے ۔ تاریخ کے منظر میں پیغمبر کی شخصیت کا زور دیکھ کر اسکی عقل دنگ رہ جاتی ہے، مگر بیچارہ اپنی نارسائی کے ہاتھوں عاجز ہے ۔ پیغمبرانہ انقلاب کی بنیادوں کو بھی یہ پرانی سامی تاریخ ہی میں ڈھونڈتا پھرتا ہے ۔ حالانکہ صداقت کا زور خود اسکے قلم سے وہ باتیں لکھوا رہا ہے جن میں سے کسی ایک کا سراغ بھی قدیم سامی معتقدات میں نہیں ملتا ۔ ترجمان القرآن

[2] اس عجیب و غریب عبارت کا مطلب کچھ پروفیسر سانتی لانا ہی جانتے ہونگے ۔ رسول اللہ کی قوم کا مذہبی رجحان کیا تھا؟ اسکے ساتھ یہ تعلیم کیونکر ہم آہنگ ہوئی؟ اور یہ اس ہم آہنگی کا "موہوم شعور" کیا بلا ہے جس نے ختم نبوت اور احیاء ملت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۱ پر دیکھئے)

ملّت اسلامیہ کی اساس

"شریعت" یعنی قانون الٰہی

اس برادری کی فطرت ہی قانون کا وہ نیا تصور پیدا کرتی ہے جو اس میں پایا جاتا ہے۔ یہ ایک دینی برادری ہے جو دین کے جھنڈے کے گرد جمع ہوتی ہے، اور اس کے اجتماع کی بنیاد "خدا کی اطاعت" ہے۔ قدیم زمانہ کے لوگوں میں، اور آج ہمارے اس جدید زمانہ میں بھی قانون اُن قواعد و ضوابط کا نام ہے جن کو عوام براہِ راست، یا کسی ایسے ذریعہ سے جو ان کی نمائندگی کرے منظور

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰ - ابراہیمی کا اعلان کرایا؟ یہ لوگ پیغمبر کے نفس کو بھی اپنے نفسیات ہی کے پیمانہ سے ناپتے ہیں۔ یہ خود تو اُن بلندیوں تک پرواز نہیں کرسکتے جہاں پیغمبر رہتا ہے، اسلیے کوشش کرتے ہیں کہ پیغمبر ہی کو ان پستیوں تک اتار لائیں جہاں یہ رہتے ہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ جس عظیم الشان آدمی نے تاریخ انسانی میں یہ بے نظیر انقلاب برپا کیا تھا وہ اپنے کارنامے کی نوعیت کا پورا شعور رکھتا تھا۔ وہ کسی "موہوم شعور" میں مبتلا نہ تھا بلکہ جس طرح ایک شخص دن کی روشنی میں مرئیات کو صاف دیکھتا ہے، اُسی طرح وہ اپنے خداداد علم کی روشنی میں اس حقیقت کو صاف دیکھ رہا تھا کہ پیغمبری کا کام اس کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ اعتقاد و اخلاق اور انسانی تعلقات کا جو متوازن نظام اس نے قائم کردیا ہے، وہ اب کسی دوسرے پیغمبر کی آمد کا محتاج نہیں ہے۔ اب اگر کوئی مدعی نبوت پیدا ہوگا تو وہ اس توازن کو درہم برہم کرنے والی قوت (Disturbing element) ثابت ہوگا۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو بار بار متنبہ کیا کہ میں آخری نبی ہوں، میرے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ ایک آدھ مرتبہ زبان سے ایسا کوئی فقرہ نکلا ہوتا تو یہ شبہ کرنے کی کچھ گنجائش بھی ہوتی کہ شاید یہ کسی "موہوم شعور" کا نتیجہ ہو لیکن قرآن کو جب ہم دیکھتے ہیں تو یہ ساری کتاب اس "شعور" سے لبریز نظر آتی ہے کہ انسان کو اس کتاب میں آخری اور مختتم ہدایات دی جا رہی ہیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پوری پیغمبرانہ زندگی میں ہم کو یہی شعور نمایاں نظر آتا ہے کہ آپ نوع انسانی کے لیے زندگی کی ایک ایسی شاہ راہ (صراطِ مستقیم) استوار کر رہے ہیں جو قیامت

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

کرتے ہیں اور اس قانون کا ماخذ انسان کی عقل، اس کی خواہش اور اس کی اخلاقی فطرت ہوتی ہے۔ اسلامی تصور اس کے بالکل خلاف ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ملت اسلامیہ کا حاکم اعلیٰ و مقتدر کل خود اللہ ہے تو پھر قانون بجز اللہ کی مرضی کے اور کوئی چیز نہیں۔ اسی اصول کے مطابق اللہ، یا دوسرے لفظوں میں اپنے برگزیدہ بندوں کا مقنن، اپنے قوانین نافذ کرتا ہے۔

اس قانون کی اطاعت بیک وقت ایک اجتماعی فریضہ بھی ہے اور دینی حکم بھی۔ اس قانون کو توڑنے والا ہر شخص صرف قانونی نظم و انضباط ہی سے انحراف نہیں کرتا بلکہ ایک گناہ کا بھی ارتکاب کرتا ہے کیونکہ اسلام میں کوئی ایسا حق نہیں ہے جس میں خدا کا حصہ نہ ہو۔ شرعی تنظیم و مذہب اور قانون ایک ہی مشیت کے دو رخ ہیں۔ اللہ کی مرضی امت اسلامیہ کے وجود اور اس کی ہدایت کا ماخذ ہے۔ ہر قانونی مسئلہ میں اولین اہمیت انسان کی نیت کو دی گئی ہے (کیونکہ معاملہ اصل میں خدا کے ساتھ ہے جو نیتوں ہی کے لحاظ سے اعمال کو جانچتا ہے)۔ اصول قانون ہر سوال کو مذہبیات کی طرف رجوع کرتا ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱ - تک انسان کی پیش قدمی کے لیے کافی ہوگی اور کسی حد پر جا کر ختم نہ ہو جائیگی کہ اس سے آگے سڑک بنانے کے لیے کسی نئے انجنیر کی حاجت ہو۔ پھر ختم نبوت کے متعلق آنحضرت صلعم کے جو ارشادات معتبر احادیث میں موجود ہیں وہ اتنے صریح، اتنے متعدد اور اس قدر پر زور (Emphatic) ہیں کہ ان کو کسی "موہوم شعور" کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ کامل شعور کا پتہ دیتے ہیں۔ پروفیسر سانتی لان کو اگر اندازہ ہوتا کہ ایک پیغمبر کی پوزیشن کیسی اہم ذمہ دارانہ پوزیشن ہوتی ہے تو وہ بآسانی سمجھ جاتے کہ ختم نبوت کا اعلان کر دینا کوئی طفلانہ کھیل نہیں ہے جس کو پیغمبر یونہی روا روی میں زبان سے نکال دے۔ یہ بات کہ "دنیا میں اب خدا کی طرف سے کوئی پیغمبر نہیں آئیگا" اتنی بڑی بات ہے کہ ایک ذمہ دار آدمی کامل علم اور پورے وثوق کے بغیر اس کو زبان سے نکالنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر سلسلہ نبوت کے جاری رہنے کا ذرہ برابر بھی امکان ہوتا تو پیغمبر جیسے ذمہ دار شخص کی زبان سے ایسی کوئی بات نہیں نکل سکتی تھی جس سے باب نبوت کے بند ہونے کا وہم تک پیدا ہو سکتا ہو۔ کیونکہ پیغمبر کی طرف سے ایسا قول موجود ہونے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ اس کو حجت قرار دے کر بعد کے

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر)

کیونکہ وہی اس کی آخری بنیاد ہے۔

اس قانون کا خاص اختیار اور اس کا طبعی رجحان کیا ہے؟ قرآن اپنے آپ کو قانونِ فطرت سے تعبیر کرتا ہے جو اللہ نے اپنے رحم و کرم سے بنی نوع انسان کو عنایت کیا ہے۔ اسلام قانون فطرت کی تجدید اور نوح اور ابراہیم کے قدیم دین کا احیا ہے جس کو نصرانیوں اور یہودیوں نے محرف و منسوخ کر دیا تھا۔ یہ جدید قانون ایک طرف تو ان سختیوں اور بہت سی پابندیوں کا خاتمہ کر دیتا ہے جو موسوی قانون کی رو سے یہودیوں پر عائد کی گئی تھیں، دوسری طرف وہ نصرانیوں کی رہبانیت کو بھی مٹا دیتا ہے، اور ساتھ ہی وہ انسان کی خامیوں، کمزوریوں اور زندگی کی عملی ضرورتوں کا بھی لحاظ کرتا ہے۔

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) علی العموم اپنے داعیوں اور عالموں کو اس قسم کی نصیحت فرماتے تھے کہ "نرمی کرو، سختی نہ کرو۔ خوش خبری سناؤ، تنفر نہ کرو"۔ قرآن کہتا ہے کہ "اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا"۔ اسلام میں تصوف کا رجحان تو موجود ہے لیکن جوگیت اور سنیاس کا رجحان بالکل نہیں۔ وہ صریح طور پر عبادت و ریاضت میں ایسی شدت کو ناروا قرار دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ انسان کا جسم کمزور ہو جائے اور اس کی فطری قوتیں دب جائیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو خدا کی عنایت کی ہوئی "طیب چیزوں" سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتا ہے۔ صرف اتنی شرط ہے کہ مسلمان حدود اللہ سے تجاوز نہ کرے، اور ان قرآنی احکام کی پابندی کرے جن کی تعداد فی نفسہٖ نہ تو زیادہ ہے اور نہ وہ نہایت سخت ہیں۔

اسلامی قانون ہر عملی جدوجہد کی حمایت کرتا ہے۔ اس کی نظروں میں زراعت، تجارت

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۔ آنے والے ہر نبی کو جھٹلائیں، اور نبی کو جھٹلانے کے معنی کفر کے ہیں۔ پھر کیا کوئی پیغمبر اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لے سکتا ہے کہ اسکے بعد کوئی سچا نبی آنے والا ہو اور وہ اپنی امت کے لیے ایسی کوئی ہدایت چھوڑ جائے جو اس نبی کی تکذیب، یعنی کفر صریح کے لیے حجت بن سکتی ہو؟ ۔ ترجمان القرآن

اور ہر قسم کے کاروبار کی بڑی وقعت ہے ۔ وہ اپنی زندگی کا بار دوسروں پر ڈالنے کو سرزنش کرتا ہے اور ہر فرد بشر سے اس بات کا خواہاں ہے کہ وہ اپنی گذر بسر اپنی ذاتی محنت کی کمائی پر کرے ۔ اس طرح اسلام ہر ایسے پیشے کو معزز سمجھتا ہے جس کے ذریعے انسان اپنے آپ کو دوسروں سے آزاد رکھ سکے بقول رینان "اسلام تو انسانوں کا مذہب ہے" اس لیے اس کی روح کا لحاظ کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی قانون کا میلان ہر انسان کو وسیع ترین حدود تک جدوجہد کرنے کی اجازت دیتا ہے اور جب اسلامی قانون کے ترجمان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کے قانون کا بنیادی اصول آزادی ہے تو ہم کو ان سے پورا اتفاق کرنا پڑتا ہے ۔

لیکن یہ آزادی یا اباحت لامحدود نہیں ہو سکتی ۔ انسان فطرۃً لالچی اور ناشکرا واقع ہوا ہے ۔ وہ دوسروں کے مال و دولت پر حریصانہ نگاہیں ڈالتا ہے ، اپنا مال خرچ کرنے میں بخل کرتا ہے ، کاہلی کی طرف مائل رہتا ہے اور اللہ کی عنایت کی ہوئی برکتوں کا شکر ادا نہیں کرتا ۔ اگر اللہ ہر فرد کو اپنی من مانی خواہش پورا کرنے کے لیے ، یعنی تمام افراد کو ناانصافی و مضرت رسانی کے لیے آزاد چھوڑ دے تو پھر انسانی تمدن کی تشکیل ہی ناممکن ہو جاتی ہے ، حتیٰ کہ کوئی فرد بشر اپنا وجود باقی رکھنے کے قابل نہیں رہتا اس لیے اللہ نے انسانی سعی و کوشش کے لیے ایک حد مقرر کر دی ہے ۔ "حد" ٹھیک وہی چیز ہے جسکو ہم قانون یا حکم کہتے ہیں جو بعض چیزوں کو حلال اور بعض چیزوں کو حرام قرار دے کر انسانی عمل کو ایک حد تک پابند کر دیتا ہے ۔ اس طرح انسان کے دور وحشت کی آزادی پر مناسب روک قائم ہو جاتی ہے تاکہ جہاں تک ممکن ہو سکے فرد یا جماعت کے لیے آزادی کو فائدہ مند بنایا جا سکے ۔

ظاہر ہے کہ کوئی قانون چند قانونی اہمیت رکھنے والی مقررہ صورتوں کے علاوہ تمام جزئی تفصیلات پر حاوی نہیں ہو سکتا ۔ رومی قانون سازوں نے کہا ہے کہ "قانون کی خصوصیت حکم دینا ، ممانعت کرنا ، اجازت دینا اور سزا دینا ہے" ۔

اسلامی قانون اپنی مذہبی نوعیت کے عین مطابق ان خصوصیات میں قانونی مداخلت کے دو بابوں کا اور اضافہ کرتا ہے، یعنی مباحات اور مکروہات۔ سرِدست تعزیراتی شعبہ سے قطع نظر کریں تو ہم کو پورے ایجابی قانون کے پانچ شعبے نظر آتے ہیں۔ اصول کی شکل خواہ کچھ ہی ہو لیکن ان سب کا مقصد و منتہیٰ ایک ہی ہے — مصالح عامہ۔ اس طرح شریعت جو مبدا کے لحاظ سے الٰہی اور موضوع کے لحاظ سے انسانی ہے، اس کا مقصد سوائے نوع انسان کے فائدے کے اور کچھ نہیں ہے۔ یہ مقصد خواہ بہ نظرِ اول نمایاں نہ ہو سکے مگر ہے بہر حال ہر حکم میں پیوست، کیونکہ خدا سے کوئی ایسی بات ظہور میں نہیں آتی جس میں اس کی حکمت اور اس کا رحم و کرم نہ پایا جاتا ہو، اور رحم و کرم کا مبدا اعلیٰ اسی کی ذات ہے۔

چونکہ انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے اسلیے اسکی زندگی کے دو رخ یعنی اخلاقی و جسمانی ہیں۔ نوع انسان کی تنظیم کے لیے اللہ نے جو قاعدے یا حدود مقرر کیے ہیں ان میں سے بعض روح سے متعلق ہیں اور بعض جسم سے۔ مذہب اور قانون نمایاں طور پر دو جدا چیزیں ہیں مگر ساتھ ہی وہ ایک دوسرے کے متمم بھی ہیں کیونکہ اپنے مشترک مقصد — مفاد انسانی — کے لحاظ سے وہ ایک دوسرے سے آپس میں مضبوطی سے جڑے ہوئے ہیں۔ روحانی زندگی کو درست کرنے اور ابدی راحت کی زندگی حاصل کرنے لیے انسان کو جن چیزوں پر ایمان لانا چاہیے ان کا تعین عقائد یعنی اصول دین کرتے ہیں۔ ایجابی قانون یعنی شرع جسکے معنے سیدھے رستے کے ہیں، اعتقائد کے ساتھ لزومی تعلق رکھتا ہے، اور یہ ایک ایسا ضابطہ ہے جو دنیاوی اغراض کے لیے انسانی جدوجہد کی راہ نمائی کرتا ہے۔ گویا شریعت اس پورے نظام کا جسم ہے اور عقیدہ اس کی روح۔ اعتقاد کا موزوں مقام قلب یا دوسرے لفظوں میں انسان کی باطنی زندگی ہے۔ ایجابی قانون کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اعتقاد و نیت ایک انفرادی معاملہ ہے جس کا فیصلہ صرف اللہ ہی کر سکتا ہے کیونکہ انسان کے دل کا حال تو صرف وہی جانتا ہے۔ ایجابی قانون کا خاص میدان، انسان کے ایسے اعمال ہیں جن کا تعلق

بیرونی مظاہر سے ہے۔ ان میں بعض اسلام کے بنیادی اصول کی پابندی سے متعلق ہیں جیسے اقرار توحید، نماز، روزہ، عشر یا زکوٰۃ اور حج۔ یہاں اعتقاد یا بالفاظ دیگر قلبی اعمال کا کوئی سوال نہیں ہے کیونکہ قلبی معاملات قانون سازی کے اختیار سے باہر ہیں، بلکہ یہاں قلبی اعمال کی جگہ جسمانی اعمال سے بحث ہے یعنے عبادت کی وہ ظاہری صورتیں جو اسلامی قانون کے احکام کے مطابق مسلمانوں پر فرض کی گئی ہیں۔ یہ فرائض نیز قانون عامہ کے وہ فرائض بھی جن کا ذکر آگے آئیگا حقوق اللہ کہلاتے ہیں۔ ان کا موضوع انسان کے وہ فرائض ہیں جو اس کے خالق سے تعلق رکھتے ہیں اور شخصی پسندیدگی یا ناپسندیدگی پر منحصر نہیں کیے جا سکتے۔[1]

[1] فاضل مستشرق یہاں اسلام کے نظام دینی کو سمجھنے میں ایک حد تک قاصر رہا ہے۔ دراصل اسلام میں عقائد، اخلاق، عبادات، اور تمدن و معاشرت (Social life) کو ملا کر جس طرح ایک ہی نظام زندگی کا جزو بنایا گیا ہے اسکی نزاکتوں کو سمجھنا آج بہت سے مسلمانوں کے لیے بھی مشکل ہے، کجا کہ کوئی غیر مسلم عالم اسکی صحیح کیفیت کا ادراک کر سکے۔ روح اور جسم کی تفریق کا جو تصور عام طور پر دماغوں میں پیدا ہو گیا ہے، اسلام میں وہ تصور موجود نہیں ہے۔ اسلام کے احکام میں یہ تفریق نہیں کی جا سکتی کہ ان میں سے بعض روحانی زندگی کے لیے ہیں اور بعض جسمانی زندگی کے لیے۔ ہر حکم جو بظاہر روحانی زندگی کے لیے نظر آتا ہے، جسمانی زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ اسی طرح جو احکام بظاہر جسمانی زندگی کے لیے ہیں ان کا نہایت گہرا، اتنا ہی گہرا تعلق روحانی زندگی کے ساتھ بھی ہے۔ مثال کے طور پر عقیدۂ توحید محض "ابدی راحت کی زندگی" حاصل کرنے ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ انسان کی پوری دنیوی زندگی میں عدل، تقویٰ، اور صحیح مجاہدہ کی روح پیدا کرنے کے لیے بھی ہے۔ نماز روزہ وغیرہ عبادات صرف خدا سے بندے کا تعلق ہی نہیں جوڑتیں بلکہ ہر ہر بندے کے انفرادی کردار (Personal conduct) اور تمام بندوں کے اجتماعی روابط (Social relations) کو بھی درست کرتی ہیں۔ حرام و حلال کے حدود، تعزیری قوانین اور حقوق و فرائض کے احکام جو بظاہر جسمانی زندگی سے متعلق نظر آتے ہیں، سب کے سب روحانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷ پر)

لیکن انسان صرف روح ہی نہیں ہے بلکہ جسم بھی رکھتا ہے - اس حیثیت سے اسکو اپنا وجود باقی رکھنے کے لیے بھی کچھ کرنا پڑتا ہے - یہیں سے معاشرتی زندگی کی نہایت اہم ضرورت پیدا ہوتی ہے - درالمختار میں ہے کہ "انسان فطرتاً سیاسی حیوان ہے کیونکہ وہ دوسرے حیوانوں کی طرح تنہا نہیں رہ سکتا بلکہ اسکو معاشرت اور باہمی امداد و اعانت کی ضرورت پڑتی ہے" لیکن ہر فرد کے رجحانات جدا، ان کی ضروریات مختلف اور ہر ایک کی قابلیتیں اور قوتیں محدود ہوتی ہیں - انسان اپنے ہم جنسوں سے امداد لینے پر مجبور ہے اس لیے اسکے پیچیدہ اور گوناگوں اغراض، تعلقات اور لین دین کے معاملات پیدا ہوتے ہیں - یہی چیزیں معاشرے کی اصل اور منبع ہیں جن میں سکہ ذریعہ و تبادلہ کا کام دیتا ہے - گذشتہ اقتباس سے ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ یونانی خیالات کتنا گہرا اور دوررس اثر رکھتے ہیں - معاشری زندگی سے پیدا ہونے والے تعلقات ہی اثباتی قانون کا مصدر اور اصل موضوع ہیں - نسل چلانے کی ضرورت، صنفی تعلق اور ساتھ ہی خاندان کی تنظیم کا باعث ہوتی ہے، اسلیے نکاح سے قانونی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۶)

زندگی سے بھی یکساں متعلق ہیں - اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی روحانی ترقی ان حدود اور ان فرائض کی پابندی کے بغیر ممکن نہیں کوئی شخص حرام کھاکر، حق داروں کے حق مار کر، اور بندگان خدا پر ظلم کرکے خدا کا قرب حاصل نہیں کرسکتا - کوئی عبادت ان گناہوں کے ساتھ نافع نہیں - اور کوئی عقیدہ انسان کو حدود اللہ پر تعدی کرنے کے نتائج سے نہیں بچا سکتا - یہ صحیح ہے کہ شرع صرف ظاہری اعمال کو دیکھتی ہے - اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ احکام شرع کو نافذ کرنے والے حکام جو حکم لگائینگے وہ صرف ظاہری اعمال کے لحاظ سے ہوگا - مگر اسلام میں تمدنی، معاشی اور اخلاقی قوانین کے پیچھے صرف سیاسی طاقت ہی کی قوت نافذہ (Sanction) نہیں ہے، بلکہ اس سے بڑی اور اصلی قوت ہر فرد مسلم کے اعتقاد کی ہے جو اس کو اندر سے بھی قانون کا مطیع بناتی ہے — اس کے نفس کو اطاعت قانون کے لیے تیار کرتی ہے - اسی مقام پر پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی نظام میں دینی اعتقاد، اخلاقی تصورات، مذہبی عبادات اور تمدن و سیاست کو جمع کردینے کی جو صورت اسلام میں اختیار کی گئی ہے وہ کیسی نازک اور کمال درجہ کی بصیرت کا نتیجہ ہے - ترجمان القرآن

تعلقات وجود میں آتے ہیں۔ تقسیم عمل اور افراد کی مختلف ضرورتوں سے لین دین اور دوسرے تعلقات کا وہ جال پھیلتا ہے جس کا حوالہ اسلامی متعلق حقوق العباد کے عام نام سے دیتے ہیں۔ اسی کو مغرب میں کشوری (Civil) اور تجارتی قانون کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن اسکو اسلامی نظام قانون مختلف شاخوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ اس خصوص میں رومی قانون میں بھی اسلامی قانون سے زیادہ شعبے نہیں تھے۔ کسی فرد کی موت سے وراثت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے جس پر ترکے اور تقسیم سے متعلقہ اصول کارفرما ہوتے ہیں۔ سب سے آخر میں معاشری تنظیم کی حفاظت کے لیے تعزیری نظام کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جس کی تفصیل بعد میں آئیگی۔ (باقی)

اعلان

اردو اکاڈمی جامعۂ ملیہ اسلامیہ دھلی نے ذیل کے ہر مضمون پر مبلغ دوسو روپیہ انعام دینا تجویز کیا ہے جن صاحب کا مقالہ سب سے بہتر ہوگا انہیں مذکورہ بالا انعام دیا جائیگا۔ اکاڈمی کا فیصلہ ناطق ہوگا۔ اس کے علاوہ اکاڈمی منتخب مقالہ جات کے حقوق اشاعت اپنے ذمہ رکھیگی۔ مقالہ میں قریباً پچاس ہزار الفاظ ہونے چاہییں اور تمام مقالے سیکرٹری اردو اکاڈمی کے پاس ۵ ار ستمبر تک پہونچ جانے چاہییں۔ جو صاحب اس مقالہ نویسی میں شرکت پسند کریں وہ پہلے اپنے مضمون کے انتخاب سے سیکرٹری کو مطلع کردیں۔

از طرف سیکرٹری اردو اکاڈمی۔ جامعۂ ملیہ اسلامیہ دھلی

فہرست مضامین :۔ اشتراکیت، فاشزم، نازی ازم، سامراج، وطنیت، سرمایہ داری، بحیرۂ روم کی سیاست، بحیرۂ الکاہل کی سیاست، امریکہ اور سیاست عالم، وسطی یورپ کی سیاست، نوآبادیوں کی تقسیم، ممالک اسلامی کی سیاست۔

حقیقتِ نفاق

منافقین کی صفات اور ان کی اقسام

از جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

(۲)

جہاد کا میدان قوتِ ایمانی کی سب سے کڑی آزمائش گاہ ہے، جہاں منافق کے لیے اپنے رنگ باطن کا چھپانا یکسر ناممکن ہو جاتا ہے۔ منافقین کا یہ گروہ، جس کا ذکر مندرجہ بالا آیات میں ہے، ہر موقع پر اپنے آپ کو چھپانے میں کچھ نہ کچھ ضرور کامیاب ہو جایا کرتا تھا، اسلامی معاملات پر ایمان و اخلاص کا پیکر بن کر آتش بیانیاں بھی کر لیتا تھا مسلمانوں کی قومی فلاح کے لیے تجاویز بھی پیش کیا کرتا تھا موقع بموقع جیب کے چند سکے بھی "راہِ خدا" میں صرف کر دیا کرتا تھا اور کسی نہ کسی طرح نمازیں بھی پڑھ لیا کرتا تھا لیکن جب خدائی احکام ان کی جانوں کا مطالبہ کرتے، وہ وقت اس کے لیے بڑا سخت ہوتا۔ جس دنیا کے عشق میں اس نے دین اور حق اور اپنے ضمیر کو بیچا تھا اگر اسی کی نذر مانگی جائے تو وہ اسکو کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اوعائے ایمان کا راز فاش ہو جاتا اور لاکھ زیر نقاب ہونے کے باوجود بے نقاب ہو کر رہتا۔ عالم الغیب بار بار قتال کا حکم دیکر، نیز بعض اوقات مسلمانوں کی جماعت کو شکستیں کھلا کر ایسے تمام فریب کاروں کی اصل تصویر کو برملا عریاں کرنے اور انھیں مسلمانوں کی جماعت سے علیحدہ کر دینے پر تُلا ہوا تھا۔ چنانچہ جب جب حکم قتال نازل ہوا، ان منافقوں نے کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور تلاش کیا۔ پھر جب مسلمان لڑ کر واپس آتے تو یہ لوگ اپنی عدم شرکت کے لیے معذرتیں پیش

کرتے اور قسمیں کھا کھا کر اپنے حسن باطن کا یقین دلانے کی سعی کرتے۔ غزوہ احد کے سلسلے میں ان عیاروں اور دنیا کے پرستاروں نے منافقت کا جو پارٹ ادا کیا سینئے قرآن اس کا تذکرہ کن لفظوں میں کرتا ہے۔

"دونوں جماعتوں کی (یعنی مسلمانوں اور کافروں کی) مڈبھیڑ کے دن (غزوۂ احد کے وقت) تمہیں جو کچھ نقصان اور ہزیمت اٹھانی پڑی وہ اللہ کے حکم کے مطابق تھی اور اس غرض سے تھی کہ (ہم تمہیں آزمائیں) اور معلوم کریں (یعنی لوگوں پر ظاہر کر دیں) کہ کون سے لوگ (واقعی) مومن ہیں اور کون سے ایسے ہیں جن کے دلوں میں نفاق ہے۔ (اس دن) منافقوں سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں لڑو یا (کم سے کم دشمنوں کی) مدافعت ہی کرو، (یہ سنکر) کہنے لگے کہ اگر ہم سمجھتے کہ آج لڑائی ہوگی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔ یہ لوگ اس وقت ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ اقرب تھے۔ اپنے منہ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جو ان کے دلوں میں نہیں تھی۔ اور اللہ تعالےٰ ان کے رازِ درون کو خوب جانتا ہے۔ (یہی وہ لوگ ہیں) جو خود بیٹھے رہے اور میدانِ جنگ میں شہید ہو جانے والوں کی نسبت کہتے رہے کہ اگر وہ ہمارا کہا مانتے تو قتل نہ ہوتے۔" (آلِ عمران)

یہ تھی نفاق کی خباثت اور اس کی حیلہ جوئی۔ دشمن صدہا میل سے چل کر اپنی پوری قوت سے میدانِ جنگ میں خیمہ ڈالے پڑا ہے اور ادھر سے جواب دیا جاتا ہے کہ لڑائی بھڑائی تو ہونے کی نہیں۔ اور جب اللہ کے مخلص جاں نثار اپنا فرض ادا کر کے شہید ہو گئے تو ہمدردانہ فرمایا جاتا ہے کہ اگر ہماری تدبیر عمل کرتے تو کیوں دنیا کی لذتوں سے ہاتھ دھوتے۔ گویا خود تو خود دوسرے انسانوں کے متعلق بھی یہ بندگانِ نفس یہ تصور کرنے سے قاصر تھے کہ آیا حق و ایمان کی اتنی قیمت بھی ادا کی جا سکتی ہے کہ اس پر اس دنیائے دنی کو قربان کر دیا جائے۔

جب سچے مسلمان بے سروسامانی کے عالم میں، دشمن کی کثرت اور اپنی قلتِ تعداد کا لحاظ کیے بغیر، رسول کی دعوتِ جہاد پر آن حاضر ہوتے تو یہی منافق ان پر آوازے کستے کہ "انہیں ان کے

دین نے دھوکے میں ڈال دیا ہے" (انفال۔۷) ان پر عقیدت کا جن سوار ہے یہ مذہبی مجنون ہیں جو کچھ نہیں دیکھتے کہ انجام کیا ہوگا۔ ان کے خیال میں اگر کوئی راہ اختیار کرنے کی ہے تو صرف اس لیے کہ وہ مادّی منفعت بخش سکے، اور اگر کوئی راہ چھوڑ دینے کی ہے تو محض اس لیے کہ اس میں جان و مال کا زیاں ہے۔ اسی ذہنیت کی دوسری تصویر ملاحظہ ہو:۔

"اور تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو میدان جہاد سے بچنے کی ٹھانے بیٹھے ہیں۔ اگر تم کسی مصیبت میں پھنس گئے تو کہنے لگے کہ خدا نے مجھ پر بڑا ہی فضل و احسان کیا کہ میں ان (مسلمانوں) کے ہمراہ نہ تھا ورنہ میں بھی پس گیا ہوتا) اور اگر (میدانِ جنگ میں) تمہیں خدا کی طرف سے کوئی فضل حاصل ہوا تو (ان کا دل جل گیا) کہنے لگے ۔۔۔ اس طرح کہ گویا تمہارے اور ان کے درمیان کبھی کوئی دوستی تھی ہی نہیں ۔۔۔ کہ اے کاش میں بھی ان (مسلمانوں) کے ساتھ ہوتا تو میں بھی بڑی کامیابی حاصل کرتا (اور مجھے بھی مال غنیمت ملتا)۔" (نساء۔۱۰)

جیسا کہ تمثیل بالا میں ذکر ہو چکا ہے، یہ ابن الوقت اس وقت تو سراپا ایمان بن جاتے جب احکام ہلکے اور بے ضرر ہوتے اور ہاتھ سے کچھ کھونے کے بجائے کچھ حاصل ہونے کی توقع ہوتی لیکن جہاں سخت احکام آتے اور ان کے دنیوی مفاد کو خطرہ لاحق ہوتا تو صاف کترا جاتے۔ ان کو اس سے بحث نہیں تھی کہ اللہ کی راہ میں لڑنے والا برسرِ حق ہے یا طاغوت کی راہ میں لڑنے والا۔ انہیں اس امر کا احساس تک نہ تھا کہ ظلم اور فساد کی بیخ کنی کرنا اور ارض الٰہی میں عدل و صلاح کی تخم ریزی کرنا بھی کوئی انسانی فریضہ ہے۔ وہ معاملات کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہی نہ تھے۔ ان کی شریعت کا فتویٰ یہ تھا کہ لڑائی اس حیثیت سے تم پر فرض ہے کہ اس میں مال غنیمت ہاتھ آتا ہے لیکن اس پہلو سے قطعاً حرام ہے کہ اس میں جان دینی پڑتی ہے۔ یہی بات مذکورۂ بالا آیات میں بیان ہوئی ہے اور اسی کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے کہ:

"اگر فوری فائدہ ہوتا اور سفر بھی (دشوار اور صبر آزما ہونے کی بجائے) متوسط قسم کا ہوتا تو یہ منافق ضرور تمہارا ساتھ دیتے۔ لیکن اس وقت (غزوہ تبوک کے وقت) مسافت انھیں بہت دور معلوم ہوئی (اس لیے وہ چپ سادھ کر بیٹھ رہے) اور (جب تم لوٹنے کے بعد اس تخلف کی وجہ پوچھو گے تو) قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہمارے لیے ممکن ہوتا اور ہم مجبور نہ ہوتے تو ضرور تمہارے ساتھ نکل کھڑے ہوتے" (توبہ - ٦)

مسلمانوں کے ساتھ اور احکام قرآنی کے ساتھ ان کا یہ برتاؤ تھا۔ اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھیے کہ اعدائے اسلام کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔:

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۨالَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّةَ .... (نسار - ٢٠)

اے پیغمبر ان منافقوں کو بشارت دے دو کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں۔ کیا یہ کافروں کے ہاں عزت کے طالب ہیں؟

دوسری جگہ کہا ہے کہ مومن کی شان یہ نہیں ہے کہ یہود و نصاریٰ وغیرہ معاندین حق سے کسی طرح کا ربط و ضبط رکھے لیکن یہ منافق کیا کرتے ہیں:

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ (مائدہ - ٨)

سو تم دیکھتے ہو کہ یہ لوگ جن کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے، کفار کے ہاں بڑی آمد و رفت رکھتے ہیں۔

نیز:-

.... قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ (محمد - ٣)

جو لوگ خدا کے نازل کیے ہوئے قرآن کو ناپسند کرتے ہیں (مثلاً یہود) یہ منافق ان سے کہتے ہیں کہ بعض باتوں میں ہم تمہارا ہی کہا مانینگے۔

اس منافقانہ سازش کی تشریح ذیل کے الفاظ میں ہے :-

.... يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ‎(حشر - ۲)

یہ منافق اپنے بھائیوں یعنی کفار اہل کتاب سے کہتے ہیں کہ اگر تم (مسلمانوں کے ہاتھوں اپنے وطن سے) نکالے جاؤ گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل چلیں گے اور تمہارے بارے میں کسی کا کہنا نہ مانیں گے۔ اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم (مسلمانوں کے خلاف) تمہاری مدد کریں گے۔

لیکن کیا جو اپنے شہوات نفس کی غلامی میں اسیر ہو کر مسلمانوں کے ساتھ نہ لڑ سکتا تھا کہ مبادا جان عزیز کے لالے پڑ جائیں وہ غیر مسلموں کے لیے اتنا وفادار اور ایثار پیشہ ہو سکتا تھا کہ ان کی خاطر گھر بار چھوڑنے اور سر بکف میدان جنگ میں اتر آنے پر تیار ہو جائے؟ قرآن ان کے ان دعاوی کو نقل کر کے فوراً ہی حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے کہ :

"اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔ اگر اہل کتاب جلاوطن کیے گئے تو یہ ہرگز ان کے ساتھ نہ نکلیں گے اور اگر ان سے مسلمانوں نے جنگ کی تو کبھی بھی یہ جھوٹے مدعی ان کی اعانت نہ کرینگے اور (بالفرض) اگر مدد کے لیے آئینگے بھی تو (جم کر لڑ نہ سکیں گے اور موت کی صورت دیکھکر) بھاگ کھڑے ہونگے"

غرض جو سلوک ان کا اہل ایمان کے ساتھ تھا بعینہٖ وہی اہل کفر کے ساتھ بھی تھا۔ یہ دراصل اپنے نفس کے دوست تھے اور اسکی خاطر مسلم و کافر دونوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے تاکہ موقع پر ہر ایک سے حق دوستی حاصل کریں اور جب کچھ نقصان اٹھانے کا موقع ہو تو اس سے محفوظ رہیں۔ یہی دورنگی کا کمال ہے جس میں جہاں تک ان کی تدبیروں کا بس چلتا، کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ ان کی پالیسی کا خلاصہ قرآن کے چند مختصر لفظوں میں یہ تھا کہ :

"یہ منافق تمہارے انجام کا انتظار کرتے رہتے ہیں اگر تم (مسلمان) بحکم خداوندی جیت گئے تو تم سے کہنے لگتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے (لاؤ ہمیں بھی مال غنیمت دو)۔ اور اگر کافروں کو فتح نصیب ہوئی تو اُن سے کہتے ہیں کہ کیا ہم تم پر غالب نہیں ہو گئے تھے اور تم کو مسلمانوں کے ہاتھ سے نہیں بچایا؟ (بس جو کچھ لڑائی میں ملا ہے ہمارا حصہ بھی لگاؤ) (نسار - ۲۰)

اور اس سے بھی زیادہ جامع و مانع ان کی تعریف یہ تھی:

مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ۔ (نسار - ۲۱) کفر اور ایمان کے بیچ میں پڑے لٹک رہے ہیں نہ مسلمانوں کی طرف ہیں نہ کافروں کی طرف۔

اور اپنی اسی مذبذب پالیسی کو وہ صلح کل کی پالیسی قرار دے کر دعوی کرتے تھے کہ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ (ہم تو سراپا اصلاح ہیں)۔ اس دورخی پالیسی کا نباہنا ان کی طلاقت لسانی پر موقوف تھا سو قرآن کہتا ہے وہ اس فن کے بڑے ماہر تھے:

"اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنکی باتیں تمہیں اس وقت دنیا کی زندگی میں بڑی ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں اور وہ خدا کو گواہ ٹھیرا کر اپنی مخلصانہ اطاعت کا یقین دلایا کرتے ہیں، حالانکہ وہ نہایت ہی جھگڑالو اور بڑے ہی فتنہ پرداز ہیں۔ اور جب تمہارے پاس سے اٹھکر جاتے ہیں تو اپنی سرگرمیاں زمین میں فساد پھیلانے کے لیے وقف کر دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈرو (اور واقعی اطاعت شعار ہو جاؤ) تو جھوٹی عزت کا خیال دامن گیر ہو کر انہیں مجبور کرتا ہے کہ غلطی پر اصرار کریں (بقرہ - ۲۵)

دوسری جگہ ہے:

"اور جب تم انہیں دیکھتے ہو تو ان کے اجسام تمہاری نگاہوں میں کھب جاتے ہیں (یعنی نہایت مہذب اور شریف معلوم ہوتے ہیں)، اور اگر وہ تم سے بات کریں تو تم ان کی باتیں سنتے ہی رہو

(کیونکہ ان کی چرب زبانی مجبوراً لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے) (منافقین۔۱)

لیکن اللہ تعالیٰ نے جس طرح ان کے اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ کے دعوے کو یہ کہکر جھٹلا دیا تھا کہ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ (یعنی جان رکھو حقیقی مفسد یہی لوگ ہیں) کیونکہ مطلب پرستی اور اتباع شہوات ہی تو فتنوں کی ماں ہے، اور یہ لوگ اسی کنہ کو سمجھنے سے قاصر تھے، اسی طرح یہاں بھی (مذکورۂ بالا سورۂ بقرہ والی آیت کے بعد ہی) مطالبہ کیا کہ اگر تم واقعی مومن ہو، جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے، تو قانون اسلامی کے مکمل تابع ہو جاؤ (اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً) اور یہ دورنگی چھوڑ دو۔ خدا کو ان بلند بانگ دعوؤں اور زبانی شین قاف کی مطلق ضرورت نہیں، اس کے نزدیک تو یہی فساد کا منبع ہے۔ چنانچہ اسی فلسفۂ اصلاح و فساد کے بارے میں منافقوں کی غلط فہمیوں کو دور کرتے ہوئے فرمایا جاتا ہے کہ:

"پھر جب کوئی محکم سورۃ نازل ہوتی ہے جس میں جہاد کا حکم مذکور ہوتا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے وہ تمہاری طرف ایسی وحشت زدہ اور ہراساں نگاہوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں جیسے کہ کسی پر موت کی غشی طاری ہو (اور اس کی آنکھیں خوف و وحشت برسا رہی ہوں) ..... تو اے منافقو! تم سے کچھ بعید ہے کہ اگر تم جہاد سے پیٹھ پھیر کر بیٹھ رہے تو بھی ملک میں فساد برپا کرتے رہو اور (خود غرضیوں کی بنا پر باہم لڑ کر) اپنے رحمی تعلقات کی دھجیاں اُڑاتے رہو" (محمدؐ۔۳)

یہاں بھی وہی بات کہی گئی ہے جو سورۂ بقرہ میں ان کے دعوائے اصلاح کے جواب میں کہی گئی تھی کہ یہ نادان جہاد کو تو، جو مصالح تمدن کا حقیقی محافظ اور امن و عدل کا سرچشمہ ہے، افساد قرار دیتے ہیں اور اپنی دورنگی پالیسی کو موجب امن و آشتی کہتے ہیں حالانکہ حقیقی افساد تو وہی خود غرضی اور مطلب پرستی ہے جو ان کی روحوں پر چھائی ہوئی ہے اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ

یہی دورنگی تھی جس کو ترک کرنے کا قرآن ان سے بار بار مطالبہ کرتا تھا لیکن جس بت کو اپنے سینوں میں چھپائے تھے اس کی عقیدت کیونکر یہ اجازت دے سکتی تھی کہ کھلے دل سے رسول کی اطاعت کاملہ کا عملاً اقرار کریں۔ زبانی دعووں کے بعد جب احکام الٰہی کی عملی اطاعت کی نوبت آتی اور میزانِ جہاد میں دین و دنیا کی متاعیں تلنے لگتیں تو آپ نے دیکھا کہ کس طرح وہ لپک کر دنیا کو اپنے سینے سے چمٹا لیتے۔ اور جہاد ہی پر کیا موقوف تھا نفع و نقصان کے ہر موقع پر ان کا شیوہ یہی تھا۔ ادعاء تو قرآن کی پیروی اور خدا کی عبدیت کا تھا لیکن جب احکام کا معاملہ ہوتا تو دفعتہً یہ رشتۂ ایمانی تارِ عنکبوت کی طرح پرزے پرزے ہو کر اڑ جاتا۔ چنانچہ قرآن ان کے اس اصول مسلمہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"اے مسلمانو! کیا تم ان منافقوں کو نہیں دیکھتے جنکا خیال ہے (یعنی جو زبان سے کہا کرتے ہیں) کہ وہ قرآن پر اور پچھلی آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں (لیکن) چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں حالانکہ خدا کا حکم یہ ہے کہ وہ اس (طاغوت) کی اطاعت کا کلی انکار کردیں ...... اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے نازل کردہ قانون اور رسول کی طرف رجوع کرو (کہ وہیں سے معاملات کا تصفیہ کرایا جائے) تو تم ان منافقوں کو دیکھتے ہو کہ تمہارے پاس آنے سے بھی رک جاتے ہیں (کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ہم گئے اور زبردستی قانون الٰہی کے مطابق فیصلہ کردیا گیا تو ہم گھاٹے میں رہیں گے)۔" (نساء - ۹)

دوسری جگہ اور زیادہ صاف لفظوں میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اور جب ان منافقین کو دعوت دی جاتی ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق راہِ فرار اختیار کرتا ہے (جب کہ مقدمہ کا فیصلہ اس کے خلاف پڑنے کا احتمال ہو) البتہ اگر حق ان کی طرف ہو (یعنی فیصلہ ان کے حق

ہیں اور ان کے حسب منشا ہو) تو سر کے بل دوڑتے ہوئے آتے ہیں"۔ (نور - ۶)

نہ صرف احکام کی پیروی سے بھاگتے تھے بلکہ:

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ (رسول اللہ کی طرف چلیں) تاکہ وہ تمہارے حق میں دعائے مغفرت کریں تو (سنتے ہی نہایت معنی خیز انداز میں) اپنے سر پھیر لیتے ہیں ....." (منافقون ۱)

اور اس کی وجہ بالکل عیاں ہے۔ مغفرت و عدم مغفرت کے فلسفہ سے انہیں کیا لگاؤ تھا جس کا دین سونے چاندی کا سکہ اور جس کی شریعت خود غرضی ہو وہ اس امر پر غور ہی کیوں کرنے لگا کہ اس دنیوی فلاح و نجات کے ماسوا بھی کوئی شے ہے جس کے حصول کی تمنا کی جائے۔ یہ گردن پھیر لینا دراصل اسی حقیقت کا ایک مظہر ہے جس کو یہ منافق اپنے شیاطین سے یہ کہکر ظاہر کیا کرتے تھے کہ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (ہم تو مذاق کرتے اور ان مسلمانوں کو بیوقوف بناتے ہیں)۔

چونکہ اس قسم کے منافق بڑی تعداد میں موجود تھے اس لیے قرآن نے ان کے حالات بھی پوری تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اب اپنے گرد و پیش نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ اس وقت بھی یہ روح نفاق کسی قالب میں موجود ہے یا نہیں؟ اس کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے آپ کو اپنے "قومی" اخبارات کے دفتروں، اپنی سیاسی انجمنوں، اپنے "ملی" زعماء کے خلوت خانوں اور صاحب بہادر کے شاہی ایوانوں کا جائزہ لینا چاہیے۔ وہاں آپ کو نظر آئے گا کہ رسول کی کامل اطاعت کو مذہبی جنون کہکر اس کا کس طرح خاکہ اڑایا جاتا ہے۔ چند ٹکوں کے عوض مساجد کی حرمتیں کس طرح بیچ دی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے روبرو اپنی اسلامیت کا کیسا دلیرانہ اعلان کیا جاتا ہے لیکن مہاتماؤں، لالوں اور رائے بہادروں کی جناب میں کس دھڑلے سے اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ کا یقین دلایا جاتا ہے۔ اگر مسلمانوں کا مجمع ہو تو فرمایا جاتا ہے کہ میں سب سے پہلے مسلمان ہوں پھر سب کچھ۔ لیکن جب غیر مسلموں کے ہاں پیشی ہوتی ہے تو اسی زبان اور اسی حلق سے صدا بلند ہوتی ہے کہ میں پہلے ہندوستانی ہوں پھر مسلمان۔ غریب مسلمان کا

سلام قبول کرنا تو باعث ننگ ہے لیکن اعدائے حق سے موالات رکھنا باعث صد افتخار سمجھا جاتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ عزت صرف میرے حضور میں ملتی ہے مگر یہ منافق کافروں کے ہاں عزت تلاش کرنے جاتے ہیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھیے کہ آج کیا ہو رہا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ پیشانی پر آستان فرنگ کا نشان سجدہ لگائے بغیر کوئی "باعزت" کہلا سکے؟ آخر یہ وائسرائے بہادر سے ہاتھ ملانے کی تمنا میں عمریں بسر کر دینے والا "مسلمان" کس سنت پر عمل کر رہا ہے؟ اس کے قلب میں وہ کونسی چیز ہے جو خدا کی باغی حکومت کو جنگ کا خطرہ پیش آنے پر اس سے اعلان کراتی ہے کہ لَئِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ[1]۔ وہ کیا چیز ہے جو مسلمان کو گاندھی اور جواہر لال اور بوس کے آستانوں پر کشاں کشاں لے جاتی ہے اور جب ہندو اخبارات سے اس کو قوم پرستی کا سرٹیفکیٹ ملتا ہے تو وہ پھولا نہیں سماتا؟ پھر وہ مسلمان کس قرآن پر ایمان رکھتا ہے جو دن رات قال اللہ وقال الرسول کے ورد میں منہمک ہے لیکن جب کہا جاتا ہے کہ آؤ اس ظالمانہ اور غیر اسلامی نظام حکومت کو الٹ پھینکو تو پوری متانت اور تقدس مآبی کے ساتھ فرما دیتا ہے کہ لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ[2]۔ جب سود کی حلت کا فتویٰ پوچھا جاتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ بالکل جائز ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہندوستان دار الحرب ہے۔ لیکن اگر کوئی اللہ کا بندہ مطالبہ کر بیٹھے کہ آؤ اسے دار الاسلام بنائیں تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی جاتی ہیں اور بنی الاسلام علیٰ خمس کی حدیث پڑھ کر اسی ہندوستان کو دار الاسلام یا کم از کم دار الامن ثابت کر دیا جاتا ہے۔ احکام الٰہی کی پیروی کا یہ حال ہے کہ اگر اپنا فائدہ ہو تب تو قرآن و سنت ہی سب کچھ ہے لیکن اگر اپنا نقصان ہو تو طاغوتی عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ اسلامی قانون وراثت اس لحاظ سے تو نہایت موزوں اور عادلانہ ہے کہ اس کے ماتحت اپنے گھر آنے والی لڑکی مال و جائداد حاصل کرے گی، لیکن اس لحاظ

---

[1] اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے۔

[2] اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ واقعی لڑائی ہو گی تو ہم تمہارا ساتھ ضرور دیتے۔

سے قطعاً غیر موزوں، نامناسب اور ناقابلِ عمل ہے کہ اپنا جمع کیا ہوا مال و اسباب لڑکیاں پرائے گھر لے کر چلی جائیں گی - غرض جدھر دیکھیے کُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا کا سماں پیشِ نظر ہے [۱]۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ [۲] اور رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا [۳] کی قدیم سنت دہرائی جا رہی ہے۔ يُعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا [۴] کی کمین گاہیں موجود ہیں اور ان کے آڑ سے خود غرضیوں اور نفس پرستیوں کے خوفناک بھیڑیے نکل نکل کر پیکرِ ملت کا خون چوس رہے ہیں - اور جب کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈرو اور آنے والی زندگی کا کچھ بھی تو خیال کرو تو معاً گردنیں اکڑ کر پھر جاتی ہیں اور اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ [۵] کا جاہلی نشہ ایک ایک رونگٹے پر چھا جاتا ہے -

مسلمانوں کے حقوق سے فائدہ اٹھانیوالے (۶) جب مدینہ میں اسلام کو کچھ طاقت اور ثبات حاصل ہو چلا اور غزوات سے مالِ غنیمت بکثرت آنے لگا تو منافقوں کا ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہو گیا جو مسلمانوں کے حقوق میں اپنا حصہ لگانے کی غرض سے اظہارِ اسلام کیا کرتا تھا - یہ لوگ بھی اپنے دوسرے ہم مشربوں کی طرح جہاد کی دعوت پر کنّی کاٹ جایا کرتے تھے - بلکہ حد سے زیادہ بزدل تھے اور دشمن کا نام سن کر کانپ جایا کرتے تھے - اس سے پہلے جس گروہ کا ذکر تھا وہ اپنی دو رخی پالیسی کی وجہ سے لڑائی کے موقع پر زیادہ ہراساں نہیں ہوا کرتا تھا - لیکن ان کا معاملہ ہی دوسرا تھا جسکی تفصیل قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

---

[۱] ان پر بجلی چمکتی ہے تو اسکی روشنی میں چند قدم چل لیتے ہیں اور جب تاریکی چھاتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں -

[۲] یہ لوگ (ادعائے ایمان کے باوجود) چاہتے ہیں کہ معاملہ کا فیصلہ خدا کی بجائے طاغوت سے کرایا جائے -

[۳] تم دیکھتے ہو کہ (نقصان کے اندیشہ سے) یہ منافق تمہاری عدالت میں آنے سے رکتے ہیں - [۴] دنیا کی زندگی میں انکی باتیں تمہارے لیے بہت ہی جاذب توجہ ہیں - [۵] جھوٹی عزت کا خیال اسے گناہ پر اصرار کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے -

"اللہ تعالیٰ تم میں سے ان منافقوں کو خوب جانتا ہے جو لوگوں کو لڑائی میں جانے سے روکتے ہیں اور اپنے بھائی بندوں سے کہتے ہیں کہ (لڑائی کے میدان میں کہاں جان دینے جاتے ہو) ہماری طرف آؤ۔ اور وہ (خود بھی) لڑائی میں نہیں جاتے مگر تھوڑی دیر کے لیے (تاکہ نام ہو جائے) اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمہارے معاملہ میں بڑے بخیل ہیں (اور تم سے یا تمہارے مقاصد سے ہمدردی نہیں رکھتے) اور جب خطرہ کا موقع آتا ہے تو تم انہیں دیکھتے ہو کہ تمہاری طرف وہ اس طرح شدت خوف سے ناچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ جیسے کسی پر موت کی غشی طاری ہو۔ پھر جب خطرہ کی گھڑی ٹل جاتی ہے (کفار شکست کھا کر بھاگ جاتے اور مسلمان مال غنیمت لیکر فتحمندانہ واپس آتے ہیں) تو نہایت چرب زبانی کے ساتھ غنائم پر ٹوٹے پڑتے ہیں .... (باوجودیکہ لشکر اعدا محاصرہ اٹھا کر واپس جاچکا ہے لیکن اب تک یہ بزدل) یہی خیال کر رہے ہیں کہ دشمن کی فوجیں ابھی نہیں گئیں۔ اور اگر یہ فوجیں پھر آموجود ہوں تو (پھر ان پر وہی دہشت طاری ہونگے اور) تمنا کریں کہ اے کاش ہم (موقع جنگ سے دور) کہیں دیہات میں نکل جائیں اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے تمہاری خبریں معلوم کیا کریں۔ (احزاب - ۲)

اس تفصیل کے اندر ان منافقین کی پوری تصویر موجود ہے۔ گو یہ گروہ، گروہ سابق کی طرح دو طرفہ فوائد حاصل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا لیکن تھا یہ بھی دنیا ہی کا پرستار اور اسکا نصب العین بھی مال کا حصول ہی تھا۔ اسی غرض سے وہ مسلمانوں میں شامل تھا اور جب کبھی ایسا موقع آتا کہ ان کا دہانِ آز صدقات یا غنیمت کے دنیاروں سے نہ بھرتا تو بہتان تراشیوں پر اتر آتا جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے:

"اور ان منافقین میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو صدقات کے بارے میں تم پر (نا انصافی

اور جانب داری کے) اشارے کرتے ہیں۔ پھر اگر ان میں سے حسب خواہش انہیں دیا جائے تو خوش رہتے ہیں اور اگر ان کی خواہش کے بموجب حصہ نہ ملا تو بگڑ بیٹھتے ہیں" (توبہ - ۷)

اسی طرح جب مسلح دشمنوں کا سامنا ہوتا تو اپنی خلوت گاہوں میں جا چھپتے۔ اور جب لڑائی کی شقیق محض غنائم لوٹنے تک ہی محدود رہتیں اس وقت یہ شیر بن کر گرجتے ہوئے گھروں سے نکل آتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے صاف حکم دیدیا کہ ایسے بے ایمانوں کو ہرگز ساتھ نہ لیجاؤ جو کل مصیبت کی گھڑیوں میں عافیت کے گوشوں کے اندر چھپے بیٹھے تھے اور اب ایمان کی تلوار بنے میدان جنگ کے لیے بےچین ہو رہے ہیں صرف اس توقع پر کہ اس وقت ہاتھ سے دینا کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے لینا ہی ہے۔ چنانچہ سفر حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والے لوگوں کے متعلق غزوۂ خیبر کے قریب وحی الٰہی آتی ہے کہ:

"جو لوگ (سفر حدیبیہ سے) پیچھے رہ گئے تھے جب تم (خیبر کی) غنائم حاصل کرنے جاؤ گے تو وہ تم سے کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔ اس سے ان کی خواہش یہ ہے کہ حکم الٰہی کو بدل دیں (یعنی خدا حکم صادر کر چکا ہے کہ جو لوگ سفر حدیبیہ میں تمہارے ساتھ نہیں گئے تھے وہ غنائم خیبر سے کوئی حصہ نہیں پا سکتے اور یہ لوگ جہاد کرنے کے بہانے سے ساتھ چلنا اور جبلکر حصہ بٹانا چاہتے ہیں) سو اے پیغمبر ان سے صاف صاف کہہ دو کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چلنے پاؤ گے۔ اللہ کا یہ پہلے ہی سے فیصلہ ہے۔"

لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیز ان کی فطرت پر کس قدر شاق تھی، وہ ایسے تر لقمہ کو منہ سے چھنتے ہوئے دیکھ کر بھلا کیونکر صبر کر سکتے تھے، چنانچہ قبل اس کے کہ عملاً یہ معاملہ درپیش ہو، اللہ عالم الغیب نے خود ہی کھول کر بتا دیا کہ اُس وقت یہ لوگ کیا کہیں گے:

فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا (فتح - ۲)

(یہ سن کر یہ منافق کہیں گے (خدا کا حکم تو خاک نہیں ہے) بلکہ تم لوگ ہم سے حسد رکھتے ہو (کہ غزوہ

میں جائینگے تو ہم بھی مال و زر حاصل کریں گے)

غور فرمایئے کہ گھوم پھر کر ہر بار ان کی نگاہ کس طرح اپنے اسی واحد نصب العین پر جاکر جمتی ہے۔ شکایت یہ نہیں ہے کہ تم ہمیں جہاد فی سبیل اللہ کے ثواب سے روک رہے ہو بلکہ یہ ہے کہ مال و متاعِ دنیا کی تحصیل سے مانع کیوں ہو رہے ہو۔ یقیناً بربنائے حسد ہی ایسا کر رہے ہو۔

ایسے منافقین کی آج اس دور میں بھی کوئی کمی نہیں ہے "حقوق مسلمین" کا شور مچانے والے مجاہدوں کو کھرچ کر دیکھیے تو اندر سے کتنے ہی ایسے نکلیں گے جنکا ضمیر خود غرضیوں کی غلاظت سے اٹ رہا ہوگا۔ گھر کی چہار دیواریوں کے اندر کان لگا کر سنیے تو اسلامی معتقدات، اسلامی نظریات، اسلامی شعائر، اور اسلامی عبادات کا مضحکہ اڑاتے نظر آئینگے۔ لیکن جیسے ہی قدم باہر نکلنے کو ہوا، اسلام کا نقاب اٹھا کر سر سے پیر تک اوڑھ لیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ محض اسی طرح مسلمانوں کے نام سے حقوقِ ملازمت میں حصہ مل سکے گا اور اگر آج اس نقاب کو نوچ پھینکیں گے تو اسلام اور مسلمان کے نام پر جو "صدقہ" خداوندان فرنگ کی طرف سے ملتا ہے اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ رہیگا۔ پھر ملازمت ہی پر کیا حصر ہے سیاسیات اسلامی کی علمبرداری بلکہ اسلام کی دینی امامت تک اسی ترکیب سے حاصل کی جارہی ہے۔ چونکہ دنیا نے جاہ و منصب کے یہی معیار قائم کر رکھے ہیں یہ لوگ ان پر پورے اترنے کی سعی میں ہر دم کوشاں رہتے ہیں۔ اس لیے اغیار کے نزدیک یہی اسلام کے ترجمان اور نمائندے ہیں۔ اور انہیں کی ترجمانی کا یہ کرشمہ ہے کہ اسلامی مفاد اب دوسرا نام ہوگیا ہے مسلمانوں کے معاشی اور سیاسی حقوق کا۔ جب کوئی اسلام کا حقیقی اور دردمند مخلص ترجمان اس گرم بازاریِ نفاق کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور اسلام کی واقعی ضروریات کو سامنے لاتا ہے تو یہ لوگ اس پر کینہ توزی اور حسد پروری کا الزام لگا کر اس کی زباں بندی کر دیتے ہیں بلکہ بعض اوقات قید و بند کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیتے ہیں، اور خود بدستور اسلام کے نام پر اپنی اغراض

کے لیے کام کرتے رہتے ہیں۔ مگر جب کبھی انھیں نام نہاد ”حقوق“ کے لیے تھوڑی بہت قربانیاں دینے کی ضرورت پیش آجاتی ہے تو آغازِ سرما کے بادلوں کی طرح چھٹ جاتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں کہ کاش ہم اس وقت لندن کے ہوٹلوں میں ہوتے اور وہیں بیٹھے بیٹھے ہندوستانی آگ و خون کی ہولی کا نظارہ اخبار کے صفحات پر کیا کرتے۔

جھوٹی شہرت کے حریص (۷) بعض منافق ایسے بھی تھے جو مفت کی شہرت اور تعریف کے لالچ میں جمعیت اسلامی کی رکنیت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کا ظہور غالباً اس وقت ہوا ہے جب اسلامی شوکت عرب کے افق سیاست پر غالب ہوتی جارہی تھی اور مسلمان اپنی جاں فروشیوں کی بدولت اپنی تاریخ میں شاندار اور معجز نما کارناموں کا اضافہ کرتے جارہے تھے۔ اُس وقت جس طرح بہتوں نے روپیہ پیسہ کے لالچ میں اپنے کو مسلمان ظاہر کرنے میں مصلحت دیکھی اسی طرح بعض نے پانچوں سواروں میں نام لکھانا اپنا مطمحِ نظر قرار دے لیا تھا۔ لیکن کسی طرح کی قربانی نہ دینا بہرحال ان کے یہاں بھی ایک طے شدہ چیز تھی۔ وہ محض دوسروں کا خون لگا کر ہی شہید بننا چاہتے تھے۔ جیسا کہ قرآن کی یہ وعید قاہرہ بتلا رہی ہے:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

اور جو لوگ اپنے کیے پر خوش ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو (نیکی اور اسلام کے) کام انھوں نے نہیں کیے ان پر ان کی تعریف ہو، ایسے لوگوں کے بارے میں تم ہرگز یہ مت خیال کرنا کہ وہ عذاب کی زد سے باہر ہیں۔ بلکہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

”ان سابقین اولین“ کے متبعین سے آج بھی ہماری جماعت خالی نہیں ہے۔ خصوصاً ہمارے سیاسی پلیٹ فارم پر تو جھوٹی شہرت کے ایسے دلدادوں کی کسی طرح کمی نہیں۔ پھولوں کے ہار اور

زندہ باد کے نعروں کی چاٹ نے لیڈروں کا ایک لشکر تیار کر دیا ہے جو قومی اجتماعوں میں اسلام اور قرآن کا نعرہ اتنے زور سے لگاتے ہیں کہ پوری قوم کا نہاں خانۂ عقیدت اس کے شور سے گونج اٹھتا ہے لیکن جس وقت زندہ باد کے نعروں کے بجائے دشمنانِ اسلام کی قہر آلود اور خشمگیں صدائیں کانوں میں آنے لگتی ہیں تو یہ ضیغمانِ ملت گھر کی سب سے محفوظ کوٹھریوں میں جا گھستے ہیں۔ پھر جب عامۂ مسلمین کی پامردیوں کے طفیل میدان کا کوئی گوشہ فتح ہوتا ہے تو پھر یہ لوگ اپنے پرانے جلالی روپ میں نمایاں ہوتے ہیں اور مختلف حیلوں سے یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس فتح کا سہرا ہمارے ہی سر بندھے، اور ہر زبان ہمیں مجاہدِ قوم اور شہیدِ ملت کے مقدس ناموں سے یاد کرے۔

(باقی)

دلائل السنن و الآثار

(۶)

از جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی

روایت معنعن معنعن اس روایت کو کہتے ہیں جس میں ایک راوی اوپر کے راوی سے بلفظ عن روایت کرتا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ یہ روایت میرے پاس فلاں شخص سے آئی ہے۔ اس میں یہ بات نہیں کھلتی کہ اس نے اُس سے خود حدیث سنی ہے یا بیچ میں کوئی راوی اور ہے جس کا نام نہیں دیا گیا۔ اسی لیے معنعن روایت میں تدلیس یا ارسال کا شبہ ہوتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لفظ عن و قال کا استعمال اکثر ارباب فن کے نزدیک مطلق اجازت و انصال کے لیے ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ تدریب میں ہے کہ "اس زمانہ میں عن کا استعمال بکثرت اجازت کے معنی میں ہوا ہے۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ قرأت علی فلان عن فلان تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس سے روایت کرنے کی اجازت رکھتا ہے۔" امام نووی فرماتے ہیں کہ "اس زمانہ میں عن کا استعمال زیادہ تر اجازۃ کے لیے ہوتا ہے، پس جب محدثین میں سے کسی نے کہدیا کہ قراءت علی فلان عن فلان تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے اس سے بطور اجازت روایت کی ہے۔"

اسی بنا پر جمہور کا مذہب ہے کہ اَن مثل عَن انصال کے لیے موضوع ہے لہٰذا جو راوی شیخ کا معاصر ہو اور بلفظ عن شیخ سے روایت کرے اسکی روایت سماع پر محمول ہوگی بشرطیکہ مدلس نہ ہو۔ بعض کے نزدیک لفظ عن کے ساتھ ایک ہم عصر شخص کی روایت اس شرط سے سماع پر محمول کی جائیگی کہ

دونوں کی ایک بار ملاقات ثابت ہو تاکہ بلفظ عن روایت کرنے میں مرسل خفی کا جو احتمال ہے وہ رفع ہو جائے۔ علی بن المدینی اور امام بخاری وغیرہ ناقدین فن کا یہی مذہب ہے۔ بہر حال مطلق احتمال سماع کوئی چیز نہیں جب تک کہ واقعی راوی اور مروی عنہ میں ملاقات اور سماع ثابت نہ ہوں اور راوی تدلیس نہ کرتا ہو۔ علامہ ابن عبد البرؒ نے نہایت عمدہ بات فرمائی ہے کہ حروف الفاظ وغیرہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ آیا ملاقات، ہم نشینی، سماع، مشاہدہ وغیرہ کا ثبوت ہے یا نہیں۔ اگر تاریخاً ثابت ہے تو محض اس بنا پر حدیث رد نہیں کی جا سکتی کہ وہ مقررہ اصطلاحی الفاظ کے ساتھ روایت نہیں کی گئی ہے۔ ہاں اگر یہ ثابت نہ ہو تو بلاشبہ احتمال لقاء و سماع عدم لقاء و سماع سے بدل جائیگا اور روایت مردود ہو گی۔ نیز یہ بات بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ جب کوئی روایت صحابی لفظ عن یا ان اور قال یا سمعت سے بیان کر دے تو تمام سلسلہ متصل سمجھا جاتا ہے، محض اس وجہ سے کہ صحابی کی عدالت و ثقاہت متفق علیہ ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ائمہ فن و ارباب کمال جو تدلیس نہ کرتے ہوں ان کی روایات میں لفظ عن وغیرہ اجازت پر محمول ہو گا اور روایت قبول ہو گی۔ حضرت امام بخاریؒ سے کسی نے ایک مرتبہ ایک حدیث کے متعلق سوال کیا جس میں تدلیس ہونے کا گمان تھا۔ آپ نے فرمایا "کیا تم کو گمان ہے کہ میں تدلیس کرتا ہوں، حالانکہ میں نے اسی تدلیس کے شبہ پر ایک شخص کی دس ہزار حدیثیں ترک کر دیں، اور اسی قدر نہیں بلکہ اس سے زائد" چنانچہ ایسی بہت مثالیں موجود ہیں کہ امام بخاریؒ نے اسی شبہ پر بہت سے لوگوں کی روایتوں کو ترک کر دیا۔

اس سلسلہ میں ایک مثال پیش نظر رکھنی چاہیے۔ امام علی رضا رضی اللہ عنہ ایک حدیث اس سند کے ساتھ روایت فرماتے ہیں: حدثنی ابی موسیٰ الکاظم عن ابیہ جعفر الصادق عن ابیہ محمد الباقر عن ابیہ علی زین العابدین عن ابیہ شہید کربلا

عن ابیہ علی المرتضیٰ ۔ امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اگر یہ سند کسی مجنون کے سامنے پڑھی جائے تو اس کا جنون دور ہو جائے"۔ یعنی یہ اتنی قوی سند ہے کہ اس کی صحت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ اب غور کیجیے کہ یہ پورا سلسلۂ سند معنعن ہے۔ اگر روایت کا معنعن ہونا مطلقاً صحتِ روایت اور رفع و اتصال کے منافی ہوتا تو یہ روایت ناقابلِ اعتبار ہوتی۔ مگر اس میں تدلیس کا کوئی قائل نہیں۔

تدلیس کے سیاسی اسباب بسا اوقات نہایت مستند و معتبر لوگوں کو بھی محض سیاسی اسباب کی بنا پر بظاہر تدلیس سے کام لینا پڑا ہے۔ مثلاً حسن بصریؒ جو بنی امیہ کے ظالمانہ دور میں تھے، اپنی روایات میں حضرت علی کا نام نہیں لیتے اور ان کا واسطہ چھوڑ کر حدیث بیان کرتے ہیں۔ اس راز کو جو لوگ سمجھتے تھے وہ بے دیکھے بھالے تدلیس کا الزام عائد کر دینے سے پرہیز کرتے تھے۔ چنانچہ علی بن المدینی فیصلہ کرتے ہیں کہ حسن بصری سے مرسلؒ روایت اگر ثقات کے واسطہ سے آئی ہو تو وہ صحاح کے حکم میں ہے۔

اصل یہ ہے کہ کوفہ و بصرہ یہ دو اسلامی شہر حضرت عمر فاروقؓ کے ایماء سے آباد کرائے گئے تھے جنکی خاک سے امام اعظمؒ، قاضی ابو یوسفؒ، حسن بصریؒ، مالک بن دینارؒ، ابن سیرینؒ، خلیل صاحب عروض وغیرہم اکابر رجال پیدا ہوئے۔ حرمین شریفین کے بعد ان ہر دو شہروں کو وسعت علم اور اشاعتِ حدیث کے اعتبار سے خاص اہمیت حاصل ہے، اور انہیں دار العلوم کا لقب دیا گیا ہے۔ امام ذہبیؒ نے اسلام کے دوسرے تیسرے دور میں جن لوگوں کو حاملین حدیث کا لقب دیا ہے اور ان کے مستقل تراجم لکھے ہیں ان میں مسروق بن الاجدع، قتادہ، شعبہ وغیرہم فن حدیث کے امام اسی سرزمین کے رہنے والے یا نزیل تھے۔ لیکن یہ ایک علمی اور تاریخی حقیقت ہے کہ اہلِ حجاز، حرمین، مصر، عوالی، خراسان، جبال، اصبہان، بلاد فارس، خوزستان اور ما وراء النہر میں شاید ہی کوئی امام تدلیس پیدا ہوا ہو، اس کے برعکس کوفہ اپنے سیاسی و مذہبی سنگم کی وجہ سے تدلیس کا مرکز تھا۔ تھوڑے سے لوگ بصرہ کے تھے، بقیہ کل

کے کل کوفہ کے رہنے والے ایک مستقل سیاسی دنگل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس طرح کے مذہبی و سیاسی فتنے خلیفۂ ثالث رضی اللہ عنہ کے وقت سے شروع ہوئے۔ پھر مسلمانوں کی باہمی آویزش مروان و حجاج وغیرہ کی صورت میں رونما ہوتی ہے اور فرق باطلہ کا زور بڑھتا ہے۔ کلامی مباحث جزو زندگی بن جاتے ہیں۔ حجاج بن یوسف جیسے ظالموں کے خوف سے صدہا اشخاص و رجال جنکی عظمتِ علمی و جلالت مذہبی مسلم تھی، یاس و قنوط کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ یہی اسباب تھے کہ سرزمین کوفہ تدلیس کا اکھاڑا بنگئی۔ رجال و طبقات کی کتابوں کی ورق گردانی کرو اور پھر اسوقت کی اسلامی تاریخ کا جائزہ لو تو محدثین کے اس قول کا صحیح مطلب تم پر واضح ہو جائیگا کہ "سب سے زیادہ تدلیس کرنے والے محدث کوفہ کے ہیں اور بصرے کے ان سے کم"۔

مثال کے طور پر واقعہ ذیل کو سامنے رکھو۔ امام حسنؒ بصری حضرت عمر فاروقؓ کی ختم خلافت سے ۲ سال قبل پیدا ہوئے۔ آپ کی تحنیک خلیفۂ دومؓ نے فرمائی، اور حضرت عثمان غنیؓ کی حیات تک مدینہ رہ کر بصرہ چلے گئے۔ اس وقت آپکی عمر ۱۴ سال کی ثابت ہوتی ہے۔ اتنی بڑی عمر تک آپ کا مدینہ میں رہنا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے شرف ملاقات حاصل نہ کرنا قیاس میں نہیں آسکتا۔ لیکن اس کے باوجود آپ اپنی روایات میں حضرت علی کا حوالہ نہیں دیتے اور براہِ راست رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بلفظ عن روایت کرتے ہیں۔ اس کی وجہ خود انہوں نے اپنے شاگرد یونس بن عبید سے بیان کردی ہے۔ یونس بن عبید نے پوچھا کہ آپ قال رسول اللہ صلعم کہتے ہیں حالانکہ آپ نے آنحضرت صلعم کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ عزیزم تمہیں معلوم نہیں کہ میں ایسے زمانہ میں ہوں جو حجاج ظالم کا زمانہ ہے۔ میں حضرت علی کا نام لینے کی طاقت نہیں رکھتاؒ۔ اس لیے جب میں قال رسول اللہ کہوں تو جان لو کہ درمیانی واسطہ حضرت علی ہیں۔

لہ ذیل تذکرۃ الحفاظ جلد اول صفحہ ۶۲ و الکوکب الدری صفحہ ۱۰۰

قابل توجہ بات ہے کہ جب حسنؒ بصری خود اس سبب کو بیان فرما رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ سرے سے حضرت علی کے ساتھ انکی ملاقات کا انکار کیا جائے۔ خود محدثین کی ایک جماعت مدینہ میں حضرت علی سے ملنے کی قائل ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت حسنؒ نے حضرت علی کو دیکھا تو ضرور ہے۔ مگر پھر کہتے ہیں کہ حضرت علی سے آپ کا سماع ثابت نہیں۔ عجیب تماشہ ہے کہ دیکھنا تو ثابت ہے مگر باوجود اسکے کہ ملاقات ہوتی ہے اور اس وقت حسنؒ بصری کی عمر بھی ۱۵ سال بتصریح ائمۂ رجال ثابت ہوتی ہے پھر بھی انکی روایت قبول کرنے میں قیل و قال سے کام لیا جاتا ہے حالانکہ محدثین کے اصول کے مطابق ایک مرتبہ بھی لقار ثابت ہو جائے تو تمام روایات معنعنہ اتصال و سماع پر محمول ہونگی۔ اسی بنا پر علامہ سیوطیؒ سماع و لقار دونوں کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں۔ "اثبتہ جماعۃ وھو الراجح عندی بوجوہ" یعنی "ایک جماعت نے اسکو ثابت کیا ہے اور یہی میرے نزدیک متعدد وجوہ سے راجح ہے"۔ ان وجوہ کو ایک رسالہ کی صورت میں علامہ شیخ محمد یحیی الٰہ آبادی معروف بہ شاہ خوب اللہ نے جمع کیا ہے۔

تنقید رواۃ کے بارے میں خلاصۂ کلام اگر کسی راوی کے متعلق مختلف ناقدین کی مختلف رائیں ہوں تو ان رایوں میں سے کسی ایک پہلو کو ترجیح دینے کے لیے حسب ذیل امور پر نظر کی جائیگی:۔

(۱) معاصر ناقدین کی اکثریت کدھر ہے؟

(۲) مختلف رتبوں کے ناقدوں میں سے اعلیٰ درجہ کے مستند ناقدین کس طرف ہیں؟

(۳) عام ناقدین کی اکثریت کس طرف مائل ہے؟

اسی طرح کسی راوی کے متعلق متاخر عہد کے غیر معاصر ناقد جب اپنی رائے دیتے ہیں تو اس کی بنیاد حسب ذیل چیزوں پر ہوتی ہے:۔

(۱) راوی کی موجودہ روایات کے ذخیرہ کی نوعیت کیا ہے اور زیادہ تر اس میں معروف یا منکر

کس قسم کی باتیں ملتی ہیں ؟

(۲) دوسرے مستند لوگوں کے بیانات سے اس کا بیان کہاں تک موافق یا مخالف ہے ؟

(۳) اس مختلف فیہ راوی کے معاصر فضلا کی رائیں اس کے متعلق کیا ہیں اور اگر وہ مختلف ہیں تو ان میں مشہور و معروف ناقدین کدھر ہیں یا ان کی کثیر تعداد کس جانب ہے ؟

(۴) متاخر ناقد نے گو خود اس راوی کو نہیں جانچا مگر اس کے متعلق اس نے اپنے شیوخ کی زبان سے کیا سنا ہے جو اس راوی کے معاصر تھے ؟

یہاں یہ طالب علمانہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ جب سنن و آثار نبوی کی تصحیح و تضعیف وغیرہ کا مدار حسّی امور پر ہے جس میں کسی اجتہاد کو دخل نہیں تو پھر بعض حدیثوں کی صحت و سقم میں اختلاف کیوں ہے اور محدثین کی رائیں رواۃ کے بارے میں متضاد کیوں ہیں ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اختلاف کے چند وجوہ ہیں :-

(۱) ایک حدیث کی دو سندیں ہیں - ایک ضعیف - دوسری صحیح - دو محدثین میں سے ایک کو وہی حدیث بسند ضعیف پہنچی دوسرے کو بسند صحیح -

(۲) دونوں کو ایک ہی سند ضعیف سے حدیث پہنچی لیکن ایک کو اسکی تائید میں دوسرے شواہد مل گئے اس لیے اس نے اسے صحیح کہا - دوسرے کو نہیں ملے لہٰذا اس نے تصحیح سے انکار کر دیا - محدثین کی اصطلاح میں حسن لذاتہٖ اور حسن لغیرہٖ کے یہی معنی ہیں - حسن لذاتہٖ وہ ہے جو خود اپنی سند کے اعتبار سے حسن ہو - حسن لغیرہٖ وہ ہے جس کو کسی دوسرے تائیدی بیان نے حسن بنا دیا ہو -

(۳) یا دونوں کو شواہد ملے مگر تضعیف کرنے والے نے اس خاص سند یا اس خاص متن کے اعتبار سے اس کو ضعیف کہا - چنانچہ جامع ترمذی کے متن میں ایسی حدیثوں کی تضعیف یوں کی گئی ہے کہ "غریب بھٰذا اللفظ" - یعنی ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث غریب ہے -

(۴) یا کسی امام کی جرح کسی راوی پر دیکھ کر حدیث کی تضعیف کی گئی حالانکہ جرح کرنے والے نے اس جرح سے رجوع کر لیا تھا جس کی اطلاع تضعیف کرنے والے کو نہیں ہوئی۔

(۵) کبھی ایک ہی امام نے کسی راوی کے حالات کا پتہ لگایا۔ اس وقت اس میں کوئی امر قادح نہ تھا۔ پھر آگے چل کر اس نے اپنی حالت بدل دی اس لیے پھر اسی امام نے جرح کر دی۔ تلامذہ میں سے کچھ لوگوں نے تعدیل سنی اور دوسروں نے جرح۔ جس نے جو کچھ سنا وہی روایت کر دیا۔

(۶) کبھی کسی راوی کا ایک امام کو مفصل حال معلوم نہ ہو سکا یا جہاں تک معلوم ہوا کوئی امر قادح نہیں تھا۔ لیکن دوسرے امام نے جا کر اچھی طرح اس کے حالات تحقیق کیے، لہٰذا اس راوی میں وہ باتیں پائیں جو قابل جرح تھیں اس لیے اس دوسرے امام نے جرح کر دی۔

یہ سب امور قابل غور و تدبر ہیں۔ جس شخص کو احکام دین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے مستفید ہونے کی لگن لگی ہوئی ہو وہ تو مجبوراً ان امور کی تحقیق میں سر کھپائیگا۔ مگر جو لوگ نبی کی ہدایت سے بے پرواہ ہیں وہ کہدینگے کہ کون مغز پاشی کرے۔ حدیث کے اس سارے ذخیرے کو آگ ہی کیوں نہ لگا دو۔

تقسیم احادیث محدثین رحمہم اللہ نے احادیث کے ذخیرہ کو دو بڑی اقسام پر تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جن کا تعلق حرام و حلال کی حدود اور عبادات کے احکام اور تمدنی معاملات کے قواعد و ضوابط سے ہے۔ دوسری وہ احادیث جو فضائل و مناقب اور اخبار غیب اور ثواب و عقاب اور قصص الاولین وغیرہ امور سے تعلق رکھتی ہیں۔

پہلی قسم کی احادیث میں حضرات محدثین بڑی چھان بین اور تحقیق و تنقید سے کام لیتے ہیں کیونکہ ان پر لوگوں کے اخلاق و اعمال کی صحت کا دارومدار ہے۔ رہیں دوسری قسم کی احادیث تو ان میں عموماً انہوں نے سہل انگاری سے کام لیا ہے۔ چنانچہ حضرات ابن مہدیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ نے صاف

تصریح فرمادی ہے کہ :-

اذا روینا عن النبی صلعم فی الحلال والحرام شددنا فی الاسانید وانتقدنا فی الرجال واذا روینا فی الفضائل والثواب والعقاب سہلنا فی الاسانید وتسامحنا فی الرجال ۔ [1]

یعنی جب ہم آنحضرت صلعم سے حلال وحرام اور احکام کے متعلق حدیث روایت کرتے ہیں تو سند میں نہایت تشدد کرتے ہیں اور راویوں کو پرکھ لیتے ہیں۔ لیکن جب فضائل اور ثواب وعقاب کی حدیثیں آتی ہیں تو ہم سندوں میں سہل انگاری سے اور راویوں کے بارے میں چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ سنن و آثار نبوی جن کا تعلق احکام وغیرہ سے ہے، ان کے بارے میں محدثین نے کوئی امر دانستہ نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اگر انہیں حضرات کی تصریحات کے مطابق دیکھا جائے تو خود روایات میں معمول بہا و غیر معمول بہا کی تمیز کا ایسا قوی اور مستحکم اصول ہاتھ آجاتا ہے جو روز روز کے فرسودہ اور بازار ہوا خیالات کا استیصال کلی طور پر کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اصول وہی قابل اعتماد ہوگا اور ہونا چاہیے جو عقل صریح و نقل صحیح کے مخالف نہ ہو بلکہ اسی سے ماخوذ ہو۔ جو بات جس نوعیت کی تھی ویسے ہی اس کے متعلق تحقیق و جستجو کے اصول بھی بنائے گئے۔ یہیں سے یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ سنن و آثار نبوی پر جو کتابیں لکھی گئیں جیسے صحاح ستہ، اور سیر و تاریخ نبوی پر جتنی کتابیں لکھی گئیں مثلاً ابن ہشام وطبقات ابن سعد وغیرہ، ان میں کتب حدیث کا جو مرتبہ ہے وہ کتب سیرت کا نہیں ہے۔ اسی طرح ترغیب و ترہیب، فضائل اعمال و فضائل قرآن، اسرائیلی روایات تفسیر اور ملاحم و مغازی کے بارے میں محدثین کی شہادتیں ہیں کہ ان میں اکثر نا قابل وثوق ہیں۔ ہاں فضائل قرآن میں صرف سورۂ فاتحہ، زہراوان، انعام، سبع طوال، کہف و یٰسین، دخان، ملک، زلزلہ، نصر، کافرون، اخلاص، معوذتین

[1] فتح المغیث وغیرہ۔

کے متعلق روایات صحیح موجود ہیں، "ما عداها لم یصح فیها شئی"[۱]۔

سنن و آثار اور احادیث و اخبار علماء اصول کے نزدیک تھوڑے سے ہیر پھیر کے بعد ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں۔ بعض فروری اور اصولی فروق کو مجملاً لکھا جاتا ہے۔

سنت و اثر | سنت کے معنی لغت میں دوام اور طریقہ مسلوکہ و محمودہ وغیرہ کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں سنت نام ہے نبی اکرم کے قول فعل اور تقریر کا۔ لیکن اہل لغت و اہل حدیث کے نزدیک عام معنی کے لحاظ سے واجب وغیر واجب سب پر سنت کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ لفظ حدیث کا کا مرادف ہے۔ اگرچہ بعض محدثین لفظ حدیث کو محض آنحضور صلعم کے قول تک محدود رکھتے ہیں لیکن عموماً اس کا استعمال وسیع معنوں میں ہوتا ہے بلکہ بعض محدثین تو موقوف[۲] پر بھی احادیث کا اطلاق کرتے ہیں۔ اس تعریف کی رو سے ایک بڑا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ بعض اکابر محدثین کے متعلق مشہور ہے کہ انھیں سات لاکھ یا اس سے کم و زاید احادیث محفوظ تھیں، درانحالیکہ احادیث صحیح و مرفوع کا اتنا سرمایہ کبھی بھی موجود نہ تھا اور نہ اب ہے۔ لہٰذا اسکا مطلب یہی ہے کہ اس تعداد میں آثار و سنن، مرفوع و موقوف تفسیر و مغازی سبھی ابواب داخل تھے۔ دیکھو امام حافظ ابو زرعہ کے متعلق حافظ ابو بکر محمد بن عمر الرازی کا قول ہے کہ "ابو زرعہ کو سات لاکھ حدیثیں یاد تھیں جن میں ایک لاکھ چالیس ہزار صرف تفسیر سے متعلق تھیں"۔

اہل فقہ کی اصطلاح میں سنت کا اطلاق واجب پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اسکا استعمال اکثر بدعت کے مقابل ہوا کرتا ہے۔ اسکی دو قسمیں کی گئی ہیں (۱) سنت ہدیٰ جسکا تارک مستحق لوم و زجر قرار دیا گیا ہے جیسے صلوٰة عیدین، اذان، اقامت، نماز جماعت، سنن رواتب وغیرہ (۲) سنن زوائد، جن کا

۱۔ تدریب۔

۲۔ موقوف اس روایت کو کہتے ہیں جسکی سند صحابی پر پہنچ کر ٹھہر گئی ہو۔

تارک مستحق ملامت نہیں، جیسے تطویل ارکان صلوٰۃ وغیرہ۔ تفصیلی بحث کتب اصول فقہ میں ملاحظہ ہو۔

حنفیہ کی اصطلاح میں سنت اس کو کہتے ہیں جسے آنحضرت صلعم نے ہمیشہ کیا ہو، البتہ کبھی کبھی ترک بھی کر دیا ہو۔

بعض اکابر محدثین نے جو احادیث کے مجموعے مرتب کیے ہیں ان کو لفظ "سنن" سے تعبیر کیا ہے، جیسے سنن ابن ماجہ، سنن نسائی، سنن ابی داؤد، سنن دارقطنی، سنن سعید بن منصور، سنن ابی مسلم الکشی، سنن کبری بیہقی وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ لفظ سنت کو بہت وسیع معنوں میں لیتے تھے۔

آثار کا اطلاق علماء اصول کے نزدیک مرفوع[۱] اور موقوف دونوں پر ہوتا ہے۔ ادعیۂ ماثورہ اسی وجہ سے کہی جاتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریق مرفوع ثابت ہیں۔ امام طحاوی نے شرح معانی الآثار اور مشکل الآثار اپنی کتابوں کے نام رکھے ہیں اور ان میں آثار صحابہ کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلعم کی مرفوع حدیثوں کا ذخیرہ بھی موجود ہے۔ علامہ سخاویؒ کا قول ہے کہ امام طبرانی کی کتاب تہذیب الآثار محض مرفوع روایات کے ساتھ مخصوص ہے، موقوفات وغیرہ تبعاً ذکر کر دی گئی ہیں۔ البتہ فقہاء خراسان کی اصطلاح یہ ہے کہ وہ لفظ اثر کو صرف موقوف احادیث کے لیے مخصوص کرتے ہیں، اور خبر کا لفظ مرفوع احادیث کے لیے بولتے ہیں۔ تہذیب الآثار طبری، معرفۃ السنن و الآثار بیہقی، الاعتبار فی الناسخ و المنسوخ من الآثار علامہ حازمی، آثار امام محمدؒ وغیرہ اسی مناسبت سے مرتب و مدون ہوئی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سنن و آثار، اخبار و احادیث کے مفہوم میں اہل علم کے نزدیک بولے جاتے ہیں۔

---

[۱] مرفوع وہ حدیث ہے جس کا سلسلہ روایت آنحضور صلعم تک پہنچتا ہو۔

حدیث و خبر آج کل کے جہلاء حدیث کو ناقابل اعتبار ثابت کرنے کے لیے قرآن مجید کی بعض آیتوں سے عجیب قسم کا مضحکہ خیز استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے "اس قرآن کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائینگے؟" وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ کا ترجمہ اس سے بھی زیادہ پر لطف ہے۔ یا تو یہ لوگ جان بوجھ کر قرآن میں تحریف کرتے ہیں۔ یا یہ اتنے جاہل ہیں کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ قرآن میں لفظ حدیث ان اصطلاحی معنوں میں نہیں آیا ہے جن میں محدثین اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں۔ تاہم اگر انہیں اس پر اصرار ہے کہ قرآن مجید میں لفظ حدیث سے حدیث نبوی ہی مراد ہے تو کیوں نہ آیات ذیل کو منکرین حدیث کے لیے شدید ترین وعید قرار دیا جائے؟ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ۔ فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ۔ مَا لِهٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا۔ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ ضحیٰ میں اپنے احسانات عظیمہ کا ذکر کیا ہے جو آنحضرت صلعم پر خود بدولت نے فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ تم یتیم تھے، ہم نے تمہاری خبرگیری و پشت پناہی کی۔ دوسرے یہ کہ تم تنگ دست تھے۔ ہم نے تمہیں خوشحال کیا۔ تیسرے یہ کہ تم راہ راست سے بے خبر تھے، ہم نے تمہیں ہدایت بخشی۔ اس کے بعد ہر احسان کے جواب میں اس کے مناسب حال شکریہ ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ پہلے احسان کا شکریہ یہ ہے کہ یتیم پر قہر نہ کرنا۔ دوسرے احسان کا شکریہ یہ ہے کہ سائل کو کبھی نہ دھتکارنا۔ اور تیسرے احسان کے شکریہ کی صورت یہ بتائی کہ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ یعنی یہ علم ہدایت کی نعمت جو ہم نے تم کو بخشی ہے اس کا چرچا کرو، اسے پھیلاؤ، اس کو کھول کھول کر بیان کرو۔ اس حکم کی تعمیل میں جو تحدیث نعمت آنحضور صلعم نے کیا اسی کا نام حدیث

ہے۔ پس اگر ہمارے دوستوں کو قرآن ہی سے حدیث کی حیثیت معلوم کرنی تھی تو سورہ ضحیٰ کو کیوں نہ ملاحظہ فرمایا؟

اصل یہ ہے کہ حدیث کے معنی بات کے ہیں اور یہ لفظ اپنے اندر بہت بڑی وسعت رکھتا ہے۔ کسی شخص کا قول۔ مدعا۔ حکایت۔ خبر۔ ان سب معانی کے لیے اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ مقامات بدیع الزمان ہمدانی کوئی حدیث کی کتاب نہیں ہے بلکہ ادب اور حکایات کی کتاب ہے۔ اس میں بھی مصنف لفظ حدثنا عیسیٰ ابن ہشام کے ساتھ حکایت نقل کرتا ہے۔ پس یہ ایک عام لفظ ہے۔ اگر اس کی نسبت کسی مورخ یا قصہ گو کی طرف ہوگی تو اس سے مراد تاریخی روایت یا افسانہ کی حکایت ہوگی اور اگر اس کی نسبت اللہ کی طرف ہوگی تو اس سے اللہ کی باتیں مراد ہونگی۔ اور اگر رسول کی طرف یہ لفظ منسوب ہوگا تو اس سے مراد رسول کی گفتگو اور آپ کے حالات ہونگے۔

عرف شرع میں حدیث سے مراد وہ چیز ہے جسکی نسبت آنحضرت صلعم کی طرف کی جائے۔ اسی لیے جمہور علماء اصول کا مذہب ہے کہ خبر، اثر، سنت یہ سب حدیث کے مرادف ہیں[1]۔ البتہ بعض کا قول ہے کہ جو آنحضرت صلعم سے مروی ہو وہ حدیث ہے اور جو غیر سے مروی ہو وہ خبر ہے۔ اسی تفریق کے لحاظ سے مورخ و قصہ گو کو اخباری اور خادم سنت کو محدّث کہا جاتا ہے۔ بعض نے دونوں میں عموم و خصوص کی نسبت بیان کی ہے، یعنی جو حدیث ہے وہ خبر ہے اور خبر کے لیے حدیث ہونا ضروری نہیں ہے[2]۔

---

[1] اصول الحدیث للبرکوی۔ [2] شرح نخبہ و توجیہ النظر وغیرہ،

تنزیل وتاویل

امثال القرآن

(۶)

از جناب مولوی محمد ایوب صاحب جیراجپوری

(۲۰) اہل کفر کے انفاق مال کی مثال:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْھُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰہِ شَیْئًا وَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ فِیْ ھٰذِہِ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا کَمَثَلِ رِیْحٍ فِیْھَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ فَاَھْلَکَتْہُ وَمَا ظَلَمَھُمُ اللّٰہُ وَلٰکِنْ کَانُوْٓا اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ۔

(اٰل عمران - ۱۲)

جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کو اللہ کی رحمت سے محروم ہو کر نہ تو ان کا مال کچھ کام دیگا اور نہ ان کی اولاد وہ آگ میں جلنے والے لوگ ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے جو کچھ یہ لوگ اس دنیا میں خرچ کرتے ہیں اسکی مثال اس ہوا کی سی ہے جس میں سخت ٹھنڈک ہو اور وہ اُن لوگوں کی کھیتی کو جا لگے جو (نافرمانی خدا کے باعث) اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے، اور اس کھیتی کو (جلاکر) تباہ کر دے۔ اللہ نے ان پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر آپ ظلم کر رہے تھے (جس کا نتیجہ اس شکل میں ظاہر ہوا)

اس تمثیل میں بتلایا گیا ہے کہ اس شخص کا انجام کیا ہوگا جو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے بجائے اپنی خواہشات نفس کی تسکین کے لیے یا شہرت و ناموری کی خاطر، یا حق کی مخالفت اور راہ راست سے دنیا کو

روکنے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے خرچ کی مثال اس کھیتی کی سی ہے جس سے کسان بڑی بڑی امیدیں لگائے بیٹھا ہو اور یکایک سرد ہوا کا جھونکا آئے اور اس کی تیز اور حد سے بڑھی ہوئی برودت ساری کھیتی کو جلا کر تباہ و برباد کر ڈالے اور لہلہاتے ہوئے سبزہ کی جگہ سوکھے ہوئے پودے چھوڑ جائے۔

لفظ "صِر" کے معنی میں ارباب تاویل کا اختلاف ہے۔ ایک قول تو وہ ہے جسے ہم نے اوپر اختیار کیا ہے یعنی برد شدید۔

حضرت ابنِ عباسؓ کا خیال ہے کہ صر کے معنی "نار" (یعنی آگ) کے ہیں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ "صر" اس آواز کو کہتے ہیں۔ جو ہوا کے تیز و تند جھونکوں سے پیدا ہوتی ہے۔

لیکن ان تینوں اقوال میں کوئی خاص منافات نہیں بلکہ تینوں باہم متلازم ہیں۔ کیونکہ صر ہوا کی اسی سخت برودت کو کہتے ہیں جسکی یبوست (خشکی) نباتات کو اُسی طرح جلا دیتی ہے جس طرح آگ۔ اور اس کے ساتھ ہی اس میں تیز آواز یعنی سرسراہٹ بھی ہوتی ہے۔

"ظلموا انفسھم" کی تہہ میں ایک خاص نکتہ ہے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ کھیتی کے جل کر تہس نہس ہو جانے کی علت خود ان لوگوں کا ظلم اور راہِ راست سے تجاوز تھا ورنہ یہ بات قانونِ قدرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی پر ایک شمہ بھی زیادتی کرے۔ دراصل ان کے اسی فعل نے پالے کو دعوت دی کہ وہ آئے اور خدا نے جو نعمت انھیں دے رکھی ہے اسے تاراج کر دے۔ پس ان کا یہ ظلم ہی وہ ہوا ہے جو ان کے اعمال اور نفقات کو ہلاک و برباد کرتی رہتی ہے یہاں تک کہ جس کشت عمل کی شادابیوں کا وہ یقین کیے بیٹھے ہیں، قیامت کے دن دیکھیں گے کہ ان کے "ظلم" کی تیز اور سرد ہوا نے اسے جلا کر بے کار بنا رکھا ہے۔

(۲۱) کلمہ طیبہ (علم حق) اور کلمہ خبیثہ (علم باطل) کی مثال:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا
كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا
ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ تُؤْتِيْ
اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا
وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝
وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ
خَبِيْثَةِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ
مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۔
(ابراہیم - ۴)

کیا تم نے اس بات پر دھیان نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے (کلمہ طیبہ کی) کیسی مثال دی ہے "وہ کلمہ طیبہ" ایک اچھی ذات کے درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط (زمین کے اندر جمی ہوئی) ہے اور جسکی شاخیں آسمان میں ہیں اور جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے یہ مثالیں اس لیے بیان کرتا ہے کہ وہ (حقائق کا) احساس کریں۔

اور "کلمہ خبیثہ" کی مثال اس (ناکارہ اور) بد اصل درخت کی سی ہے جو (بآسانی) زمین کے اوپر سے اکھڑ آئے (اور) اسے کوئی جماؤ اور مضبوطی حاصل نہ ہو۔

یہ دو متقابل مثالیں ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے فطری جوہروں کو مشاہد کرنے کے لیے بیان فرمایا ہے - ہم ان دونوں مثلوں کی الگ الگ تشریح کرینگے۔

پہلی مثال میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ "کلمہ طیبہ" ایک عمدہ درخت کے مانند ہے۔ وجہ مشابہت بالکل عیاں ہے - کلمہ طیبہ سے اعمال صالحہ کے پھل نکلتے ہیں جس طرح کہ عمدہ درخت سے کار آمد اور عمدہ پھل پیدا ہوتے ہیں - جمہور مفسرین کے اقوال سے یہی تاویل مفہوم ہوتی ہے جن کا خیال ہے کہ کلمہ طیبہ سے مراد کلمہ شہادت لا الٰہ الا اللہ ہے، کیونکہ یہی کلمہ تمام ظاہری اور باطنی اعمال صالحہ کا سرچشمہ ہے، اور ہر نیک عمل اسی کلمہ کا ثمرہ۔

علی ابن ابی طلحہ نے اپنی تفسیر میں ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ کلمہ طیبہ شہادت توحید ہے" اور شجرۂ طیبہ، ذات مومن "اصلها ثابت" کا مطلب یہ ہے کہ قول لا الٰہ الا اللہ

مومن کے قلب میں جڑ پکڑے ہوئے ہے اور "فرعہا فی السماء" کنایہ ہے اس امر کی طرف کہ یہی کلمۂ شہادت مومن کے اعمال کو عرشِ الٰہی تک پہنچاتا ہے۔

ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ کلمہ طیبہ سے مراد ایمان ہے۔ یہاں ایمان ہی کو شجرہ طیبہ سے تشبیہ دی گئی ہے، اور اصل ثابت سے مقصود اخلاص ہے۔ اور ایمان و اخلاص سے جو خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے اس کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچنے والی شاخ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اگرچہ کلمہ طیبہ کی تاویل ان دونوں اقوال میں ایک ہی ہے لیکن ہمارے خیال میں پوری تمثیل کی یہ آخری توضیح زیادہ صحیح ہے۔ اس تشریح سے تشبیہ میں کھلی ہوئی مطابقت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا حسن بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ مشبہ وہ شجر توحید ہے جو مومن کے دل میں اُگ رہا ہے اور مشبہ بہ وہ عمدہ اور پاکیزہ درخت ہے جسکی جڑ نہایت مضبوط ہو، جسکی شاخیں آسمان سے باتیں کرنے والی ہوں اور جو برابر پھل دیے جا رہا ہو۔ غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام صفات "شجر توحید" میں کس طرح پائی جاتی ہیں۔ اس کی جڑیں قلبِ مومن کے ریشہ ریشہ میں پیوست ہوتی ہیں۔ اسکی شاخہائے اعمال صالحہ آسمانوں تک جا پہنچتی ہیں۔ اور وہ ہر آن، ہر لحظہ نیکیوں کے اتنے ہی زیادہ پھل لاتا رہتا ہے جتنا زیادہ اس کی جڑوں میں ثبات ہوتا ہے۔ یعنی جتنا ہی زیادہ اس (شہادت توحید) میں اخلاص اور اذعان ہوتا ہے اور جتنا زیادہ قلب کو اس کے جمال سے عشق، اس کے حقائق کی معرفت اور اس کے مقتضیات کی برآری کا لحاظ رہتا ہے اتنے ہی زیادہ اس سے نیک افعال صادر ہوتے ہیں۔

پس جس شخص کے قلب میں یہ کلمہ طیبہ اپنی کامل حقیقت کے ساتھ جم گیا اور جس کا باطن اس کے لاہوتی رنگ میں پوری طرح رنگ گیا، یقین کرو کہ وہی اُس ماہیتِ الوہیت کا حقیقی رازدان ہے جس کا نشیمن یہی قلبِ مومن ہوا کرتا ہے۔ پھر نہ صرف اسکی زبان واحدانیت کی گواہی دیتی ہے بلکہ اس کے سارے جوارح سے توحید کی شہادت تراوش کرنے لگتی ہے۔ اس کے بعد وہ اس ماہیت (یعنی مقام الوہیت)

اور اس کے تمام لوازم کی خدا کے سوا ہر دوسری چیز سے نفی کر دیتا ہے اور ساری مخلوق کو اپنا ہی جیسا ہیچ اور مجبور محض سمجھنے لگتا ہے۔ اس وقت دنیا اپنی نگاہوں سے صاف طور پر دیکھتی ہے کہ یہ کلمہ طیبہ، جو اس کے دل پر نقش ہے اور جس کا اس کی زبان سے ہر وقت اعلان ہوتا رہتا ہے، کس طرح دم بدم نیکیوں کے حیات آفریں پھل دیتا رہتا ہے، ایسی نیکیاں جو برابر اللہ کے حضور میں پہنچتی رہتی ہیں۔ گویا یہی کلمہ طیبہ ان اعمال کو بارگاہ الٰہی میں پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ پھر یہی کلمہ بہت سے دوسرے کلمات طیبہ پیدا کرتا ہے جن کے ساتھ مزید نیک اعمال ظہور میں آتے ہیں۔ اور یہ نیک اعمال ان کلمات طیبہ کو اٹھا کر حضور الٰہی تک لے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ذیل کی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ۔ (فاطر-۲)

اللہ ہی کی طرف کلمہ طیبہ (یعنی اچھی بات) پہنچتا ہے عمل صالح اسے اٹھاتا اور بلند کرتا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بتلا دیا ہے کہ عمل صالح ہی کلمہ طیبہ کو عرش تک پہنچاتا ہے۔ اور مثال زیر بحث میں اتنی بات اور فرما دی ہے کہ یہی کلمہ مومن سے اچھے اعمال کراتا ہے۔ اب ان دونوں آیتوں کو ایک ساتھ ملا کر پڑھیے۔ مقصود الٰہی بالکل روشن ہو جاتا ہے۔ جب کوئی شخص کلمۂ توحید کی اصل اسپرٹ کو سمجھ جاتا ہے اور اس سمجھ جانے کا اثر اس کی عملی زندگی میں نمایاں ہو جاتا ہے تو بس یوں سمجھو کہ یہ کلمہ ایک ایسے درخت کی طرح ہے جس کی جڑ اس کے قلب میں مضبوطی کے ساتھ جمی ہوئی ہے اور اس کی شاخیں آسمانی کناروں تک جا پہنچی ہیں اور وہ درخت برابر پھلتا رہتا ہے۔

"شجرۂ طیبہ" کی تاویل میں سلف کے مختلف اقوال مذکور ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شجرۂ طیبہ سے مراد کھجور کا درخت ہے۔ اور حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے اسی قول کی تائید ہوتی ہے۔

ایک جماعت کا خیال ہے کہ شجرۂ طیبہ خود ذات مومن ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور عطیۃ العوفی وغیرہ اکابر کی یہی رائے ہے۔

لیکن دراصل ان دونوں قولوں میں اختلاف نہیں۔ نفس تشبیہ پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ برکات کے لحاظ سے مومن اور کھجور کے درخت کو ایک دوسرے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اگر کھجور کا درخت شجرۂ طیبہ ہوسکتا ہے تو مومن کا وجود بدرجۂ اولیٰ ہوسکتا ہے۔ اس لیے مشبہ بہ خواہ اسے قرار دو خواہ اُسے، مقصود تشبیہ میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

ایک اور تیسرا قول یہ بھی ہے کہ یہ شجرۂ طیبہ جسکا ذکر مثال زیر بحث میں ہوا ہے، جنت کا ایک درخت ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ تشبیہ کا مقصد اس سے بھی پورا ہوجاتا ہے۔

اس مثال کے اندر اسرار و معارف کا جو بیش بہا خزانہ پوشیدہ ہے وہ بس اسی مرکز علم و حکمت ہی کا حصہ ہے جس نے اسے بیان فرمایا ہے۔ آؤ اس کے بعض محاسن کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

درخت میں چار چیزوں کا وجود ضروری ہے۔ جڑ، تنہ، شاخیں اور پھل۔ شجر ایمان کے اندر بھی ان چاروں چیزوں کا وجود ہونا چاہیے تاکہ مشبہ اور مشبہ بہ میں کامل مطابقت ظاہر ہوسکے۔ سو علم و معرفت اور اذعانِ قلب شجر ایمان کی جڑ ہے۔ اخلاص اس کا تنہ ہے، اعمال اس کی شاخیں ہیں اور پھل وہ اخلاق حسنہ اور وہ صفات حمیدہ ہیں جو ان اعمال صالحہ کے کرنے سے لازمی طور پر فطرت انسانی میں پیدا ہوجاتے ہیں۔ انھیں تمام اشیاء کا لحاظ کرکے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ کس دل میں ایمان ہے اور کس میں نہیں۔ اگر کسی کے اندر یہ تمام چیزیں موجود پائی جائیں، یعنی اگر اس کا علم عالم الغیب کی نازل کردہ کتابوں کے مطابق ہے، اگر اس کا اعتقاد اس معیار پر صحیح اترتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی زبانی بیان فرمایا ہے، اگر اخلاص کا نور اس کے دل میں موجود ہے اور اعمال ان اشیاء مذکورہ کے اقتضاء کے موافق صادر ہورہے ہیں تو سمجھنا چاہیے کہ ایمان کا شجر مبارک اس کے قلب میں اُگا ہوا اور تروتازہ ہے، جسکی جڑیں مضبوط اور جسکی ٹہنیاں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اگر معاملہ برعکس ہو تو یقین کرلینا چاہیے کہ اس قلب کی سطح پر جو درخت لگا ہوا ہے وہ ایک

ناکارہ اور بے جان درخت ہے جسکی جڑوں میں کوئی دم نہیں اور جو ایک جھٹکے میں اکھڑ جانے والا ہے۔

پھر یہ دیکھو کہ کوئی درخت اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس کی آبیاری نہ ہوتی رہے۔ پانی دینا چھوڑ دو کچھ دنوں میں خشک ہو جائیگا۔ شجر اسلام کا بھی یہی حال ہے۔ انسان اس کی باقاعدہ دیکھ بھال نہ رکھے اور برابر تدبر و تفکر اور علم نافع اور عمل صالح سے اس کی آبیاری نہ کرتا رہے تو اس کی شادابی حیات آج نہیں تو کل ضرور ختم ہو جائیگی۔ چنانچہ مسند امام احمد بن حنبل میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:

"ایمان کپڑے کی طرح پرانا ہو جایا کرتا ہے لہٰذا اپنے ایمانوں کو نیا (تازہ) کرتے رہو"

یہیں سے یہ نکتہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ انسان کی حیات ایمانی کے لیے ان موقت اور پیہم عبادات کی کیسی شدید ضرورت ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا اہم احسان ہے کہ اس نے اُس شجر توحید کو ترو تازہ رکھنے کا سامان بہم پہنچا دیا ہے، جسکی کاشت اس نے ہمارے قلوب میں کر رکھی ہے۔

اچھے باغ یا عمدہ زراعت حاصل کرنے کے لیے قدرت کا یہ مقررہ قانون ہے کہ اسے بیگانے پودوں سے پاک صاف ہونا چاہیے۔ اگر مالی اپنے باغ کو یا کسان اپنی کھیتی کو ایسے پودوں اور ایسی گھاسوں سے محفوظ رکھتا ہے اور انھیں کھود کھود کر پھینکتا رہتا ہے تو اس کا باغ پوری طاقت کے ساتھ بڑھے اور پھیلے گا۔ اس کے پودوں کو کامل روئیدگی حاصل ہوگی۔ اس میں نہایت کثرت سے عمدہ اور پاکیزہ پھل آئینگے۔ لیکن اگر وہ ایسا کرنا چھوڑ دے تو خودرو پودے اور بیگانہ جھاڑ جھنکار سارے باغ میں پھیل جائینگے، زمین کی قوت نمو کو جذب کرتے جائینگے اور کسان کا اصل مقصود یعنی پاکیزہ پھل لانے والے درخت غذا کی کمی کی وجہ سے بے جان اور پژمردہ ہو کر رہ جائینگے۔ ان میں اول تو پھل آئینگے

ہی نہیں اور اگر تھوڑے بہت آئے بھی تو ناقص اور ناکارہ ہونگے۔ چنانچہ جو کم فہم اور ناتجربہ کار باغبان اس بات کو نہیں سمجھتا وہ بڑے گھاٹے میں رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔

پس مومن کو ہمیشہ دو باتوں کی سعی کرنی چاہیے۔ ایک تو یہ کہ اس شجر ایمانی کو برابر پانی دیتا رہے دوسری یہ کہ اس کے ماحول کو اشجار خبیثہ سے پاک صاف رکھے۔ پانی دینے ہی میں اس کی بقا اور دوام ہے اور دیکھ بھال ہی اس کے کمال نشو و ارتقار کی ضامن ہے۔

یہ ان اسرار و حکم کے بعض پہلو ہیں جو اس پُر معنی تمثیل کی تہوں میں چھپے ہوئے ہیں اور غالباً اُس سمندر کے مقابلہ میں ایک قطرہ ہی کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس کی گہرائیوں میں مستور ہے، اور یہ ہمارے اذہان کی نارسائی، ہمارے قلوب کی بے نوری، ہمارے علوم کی کوتہی اور ہمارے اعمال کی بے برکتی کا قصور ہے کہ ہم اس سے زیادہ اپنے ظرف میں نہیں لے سکتے۔ ورنہ اگر ہمارے دل میں روشنی، ہماری روحوں میں پاکیزگی، ہمارے ذہنوں میں جلا اور ہمارے اعمال میں خلوص ہو اور ہم اللہ اور اس کے رسول سے حقیقت کے انوار اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں تو یقیناً کلام الٰہی کے وہ اسرار و معارف ہم پر منکشف ہو جائیں جنکی تابانیوں کے سامنے یہ سارے رسمی علوم اور یہ ساری دنیوی قال اقول ماند پڑ جائے۔ یہی وہ نعمت ہے جو صحابۂ کرام کو نصیب ہوئی اور دوسرے اس سے محروم ہیں اور اسی سے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے علم و عرفان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ واللہ یختص برحمتہ من یشاء۔

دوسری مثال میں دراصل پہلی ہی مثال کا مقابل پہلو واضح کیا گیا ہے کہ "کلمہ طیبہ" کے مقابلہ میں "کلمہ خبیثہ" کی کیا ماہیت ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ یہ کلمہ اس شجر خبیث کے مشابہ ہے جو معمولی جھٹکے میں اکھڑ جانے والا ہو۔ جس میں نہ کوئی مضبوط جڑ ہو، نہ بلند و بالا شاخیں ہوں، نہ اچھے پھل ہوں، نہ سایہ ہو، نہ سبزہ ہو، غرضیکہ سر سے پاؤں تک اس کے اندر کوئی حسن و خوبی اور کوئی خیر و منفعت نہ ہو۔

"کلمہ خبیثہ" سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق سلف سے چند اقوال مذکور ہیں۔ ضحاک فرماتے

ہیں کہ کلمہ خبیثہ کافر کو کہا گیا ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ (اس درخت کی طرح، جس کی صفات اور ماہیت کا اوپر ذکر ہوا) کافر کے اعمال خیر کی روح سے خالی ہوتے ہیں، ان میں کوئی ثبات اور وزن نہیں ہوتا اور نہ اللہ تعالیٰ ان میں کوئی برکت اور منفعت عطا فرماتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک کلمہ خبیثہ سے مراد شرک ہے اور شجرۂ خبیثہ سے مراد کافر ہے یعنی مشبہ شرک اور مشبہ بہ کافر کی ذات ہے۔ آیت کا مدعا یہ ہے کہ شرک کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی جس پر مشرک اعتماد کر سکے۔ وہ اپنی صداقت پر کوئی دلیل نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ کوئی مشرکانہ عمل قبول نہیں کرتا اور نہ اسے اللہ کے حضور میں رسائی ہوتی ہے۔ اسی حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے کہ "نہ تو اس شجر خبیث میں کوئی مضبوط جڑ ہے جو زمین میں جمی ہو، نہ ہی اوپر کی طرف شاخیں ہیں" یعنی مشرک کے جیب و دامن میں کوئی نیکی نہیں ہوتی جسے دنیا یا آخرت میں کوئی وزن حاصل ہو۔

ایک صاحب علم سے پوچھا گیا کہ کلمہ خبیثہ کی حقیقت کیا ہے؟ فرمایا نہ تو اس کے لیے زمین میں کوئی جائے قرار ہے نہ آسمان میں کوئی محل صعود، بلکہ وہ اپنے قائل اور متبع کی گردن میں لٹکا رہتا ہے اور اس وقت تک لٹکا رہیگا جب تک کہ قیامت نہ آجائے۔

ان دونوں مثلوں کے بیان کرنے اور کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی حقیقتیں عریاں کر دینے کے بعد اللہ تعالیٰ ان دونوں کے آثار و نتائج پر روشنی ڈالتا ہے، اور اپنی صفت عدل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۚ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۔ (ابراہیم - ۲۷)

جو لوگ ایمان لائے ہیں انھیں اللہ تعالیٰ پکی بات (یعنی کلمہ طیبہ) کے ذریعہ دنیا کی زندگی (میں بھی) اور آخرت میں بھی وہ ثبات (دوامی) بخشتا ہے۔ اور اللہ ظالموں کو آوارہ و بے راہ بنا دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

اس آیت میں انسانی فلاح کا حقیقی راز کھول دیا گیا ہے۔ خدا کی اسی نوازش پر جسے اس نے ثبات اور جماؤ اور قرار بخشنے سے تعبیر کیا ہے، انسان کی کامرانی یا محرومی کا دار و مدار ہے۔ کوئی شخص ایک لمحہ کے لیے بھی اس نوازش سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اگر خدا کسی کو اپنی اس ثبات بخشی کی نعمت سے محروم کر دے تو دیکھتے دیکھتے اس کے ایمان کی اور اسکی زندگی کی بنیادیں ہل جائیں۔ عام انسان تو ایک طرف رہے خود تمام انسانوں کے سردار اور دنیا کے سب سے بڑے صاحب ایمان (بندہ درجی فداہ) کے بارے میں خدا کہتا ہے کہ:

لَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل)

اگر ہم تمہیں ثبات نہ بخشتے تو تم ان مشرکوں کی طرف کچھ (نہ کچھ) ضرور جھک پڑے ہوتے۔

دوسری جگہ ہے:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۔ (ہود - ۱۰)

اور اے پیغمبر! گذشتہ انبیاء کے جتنے قصے ہم تم سے بیان کرتے ہیں ان کے ذریعہ ہم تمہارے دل کو ثبات اور مضبوطی بخشتے ہیں۔

دیکھو حق پر مضبوطی سے جمے رہنے کے لیے پیغمبر کو بھی تائید الٰہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر یہی وہ توفیق الٰہی تھی جس نے صحابہ کرامؓ کی ایک مٹھی بھر جماعت کو اپنے سے تگنے دشمنوں کے مقابلہ میں فتحمند کیا۔ اور فتح کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات گناتے وقت مسلمانوں کو یاد دلایا کہ:

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰۗىِٕكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ (انفال - ۲)

یاد کرو اس وقت کو جب تمہارا پروردگار (مدد کے لیے نازل ہونے والے) ملائکہ پر وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں پس مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔

نہ صرف دنیا کی زندگی میں بلکہ آخرت میں بھی یہ توفیق مومنوں کے شامل حال رہے گی،

جیسا کہ آیت زیر بحث میں تصریح ہے اور حدیث (مشہور حدیث تجلی) میں بھی آتا ہے کہ "وھو یسألھم ویثبتھم" (یعنی اللہ تعالیٰ مسند عدالت پر بیٹھا ہوا ان مومنوں سے سوالات کرے گا اور ساتھ ہی دل میں قوت اور ثبات بھی بخشتا جائیگا)۔ اور حقیقت مرنے کے بعد ہی کا وقت ایسا ہوگا جبکہ انسان کو اس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کا شان نزول ہی عذاب قبر فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں بروایت براءؓ بن عازب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ:

"جب مومن قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے تو ایک آنے والا اس کے پاس آتا ہے اور اس سے پوچھتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ تیرا پیغمبر کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام ہے اور میرے پیغمبر محمد صلعم ہیں۔ یہ سن کر وہ اسے زور سے جھنجھوڑتا ہے اور پھر پوچھتا ہے کہ بتا تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور یہ آخری آزمائش ہے جس سے مومن دوچار ہوتا ہے اور یہی وہ وقت ہے جسکے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ الخ — چنانچہ بندہ پھر جواب دیتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام ہے اور میرے رسول محمد صلعم ہیں۔ فرشتہ یہ سن کر کہتا ہے کہ صدقت (تو نے سچ کہا)"

صحاح کے اندر تھوڑی سی کمی بیشی کے ساتھ یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے بعض میں ہے کہ آنے والا فرشتہ ایک نہیں بلکہ دو ہونگے اور مردہ کو زندہ کر کے یہ سوالات کریں گے۔ اسی طرح دوسری روایتوں میں اسی قبیل کی بعض اور تفصیلات بھی ہیں۔

"القول الثابت" سے مراد قول حق اور کلمہ صدق ہے، یعنی قول باطل اور کلمہ کذب کا ضد۔ کیونکہ قول کی دو ہی قسمیں ہیں۔ ایک قول وہ ہوتا ہے جس کے اندر کوئی حقیقت ہوتی ہے۔ دوسرا

وہ جو حقیقت سے عاری ہوتا ہے۔ حقیقت رکھنے والے قول کو قول ثابت کہا گیا ہے، اور قول اثبت (یعنی ثابت ترین قول) کلمہ توحید ہے کیونکہ یہی وہ سراپا حقیقت قول ہے جس کے ذریعہ اللہ اپنے بندوں کو دنیا و آخرت کی ہر زندگی میں ثبات اور قوت بخشتا ہے۔ اس قول کے اندر اتنی قوت ہوتی ہے کہ انسان جب اس کی کنہ تک پہنچ جاتا ہے تو ساری مادی قوتیں اس کے سامنے ہیچ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ نہ سچے آدمی سے بڑھکر دنیا میں کوئی جری شجاع اور قوی القلب ہوتا ہے نہ جھوٹے سے بڑھکر کوئی ذلیل بزدل اور بے حمیت۔

(۲۲) خدا کے حضور دنیوی تعلقات کی بے اثری کی مثالیں:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ۔

کافروں کے لیے اللہ تعالیٰ زوجۂ نوحؑ اور زوجۂ لوطؑ کی مثال دیتا ہے کہ یہ دونوں عورتیں ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کے نکاح میں تھیں لیکن انہوں نے (ان کی پیروی کرنے کے بجائے) ان سے غداری کی (اور ان کے خلاف خدا کے نافرمانوں اور گمرہوں سے ملی رہیں) اس لیے ان کے شوہر (اپنی پیغمبرانہ برگزیدگی کے باوجود) اللہ کے مقابلہ میں ان کے کچھ کام نہ آئے اور ان سے کہا گیا کہ اور دوزخیوں کے ساتھ تم بھی دوزخ میں جا داخل ہو۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ۔ (تحریم ۲)

اور اللہ تعالیٰ مومنوں کے لیے زوجۂ فرعون کی مثال بیان کرتا ہے جب کہ اس نے کہا اے میرے پروردگار! میرے لیے اپنے ہاں بہشت میں ایک گھر بنا اور

مجھے فرعون اور اس کے (برے) اعمال (کی لعنتوں) سے نجات دے اور مجھے بچا ان ظالم سے۔ نیز (دوسری مثال اللہ تعالیٰ) عمران کی بیٹی مریم کی دیتا ہے۔ جو پاکباز اور عفیفہ تھی۔ پھر ہم نے اپنی روح اس میں پھونکی۔ اور اس نے ہمارے کلمات اور ہماری کتابوں کی تصدیق کی۔ نیز وہ ہمارے فرمانبردار باادب بندوں میں تھی۔

ان آیات میں تین مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک کافروں کے لیے اور دو مسلمانوں کے لیے۔

پہلی مثال میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کی پاداش آدمی کو بہرحال ملے گی خواہ اس کا رشتہ کیسے ہی برگزیدہ و مقدس لوگوں سے ہو۔ بزرگوں کے ساتھ اس کے جو نسبی و صہری وغیرہ دنیوی رشتے بھی ہوں، ان میں کوئی اسے نہ بچا سکے گا۔ کیونکہ یہ تمام رشتے قیامت کے دن کٹ چکے ہونگے۔ اگر کوئی رشتہ اس دن کام آسکتا ہے تو وہ رشتہ ہے جسے خدا کے فرستادوں نے خدا اور بندوں کے درمیان قائم کیا ہے۔ ورنہ اگر یہ رحمی، نسبی اور ازدواجی تعلقات منکرین خدا کے حق میں کچھ بھی منفعت بخش ہو سکتے تو نوح اور لوط علیہما السلام کے رشتہ ہائے ازدواجی ان کی بیویوں کے حق میں ضرور مفید ثابت ہوتے جو اگرچہ زمرۂ کفار میں تھیں لیکن ان کے شوہر وقت کے سب سے بڑے باخدا انسان تھے۔ مگر ہوا یہ کہ اتنے قریبی رشتے بھی ان کافر عورتوں کے کچھ کام نہ آئے اور وہ بھی تمام کفر کیشوں کی معیت میں، بالکل انہیں کی طرح مستحق جہنم قرار دے دی گئیں۔

یہ آیت ان تمام لوگوں کی جھوٹی امیدوں کی جڑ کاٹ دیتی ہے جو خود تو دن رات معصیت الٰہی میں ڈوبے رہتے ہیں لیکن توقع رکھتے ہیں کہ فلاں مرد صالح کا دامن اتصال ہمیں اپنے اندر چھپا لے گا اور ہم اخروی سزاؤں سے بچ جائینگے۔ فرض کر لو کہ ایسی بے بنیاد توقعات رکھنے والے کا تعلق اس شخص سے بہت ہی قوی ہے جس کے طفیل یہ رند خراباتی اپنے کو جنت کا وارث سمجھ بیٹھا ہے، لیکن کیا کوئی تعلق، زوجیت اور ابوت و ابنیت کے تعلقات سے بھی زیادہ گہرا زبردست ہو سکتا ہے؟

پھر اگر حضرت نوحؑ اپنے چہیتے بیٹے کو، حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ کو اور حضرت نوح و لوط علیہما السلام اپنی بیویوں کو خدا کی پکڑ سے نہ بچا سکے تو تا بدیگراں چہ رسد۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں قانون مجازات کے اس اصل الاصول کو کئی جگہ بیان فرمایا ہے سورۂ ممتحنہ میں ہے:

"تمہاری رشتہ داریاں اور تمہاری اولادیں قیامت کے روز کچھ کام نہ آئینگی اللہ تعالیٰ (ہی) تمہارے درمیان (بالکل ٹھیک ٹھیک) فیصلہ کرے گا"

دوسری جگہ ہے:

"(قیامت کا دن وہ دن ہے) جب کوئی کسی کو کچھ بھی فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ اور سارا معاملہ اس دن اللہ ہی کے اختیار میں ہوگا" (سورہ انفطار - ۱)

ایک مقام پر اور آتا ہے کہ:

"لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو اور خوف کھاؤ اس دن کا جب نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام آئیگا۔ اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے" (لقمان - ۴)

یہ تمام آیات مشرکین کی ان ساری باطل تمناؤں کو جھٹلا رہی ہیں جو محض کسی کے "طفیل" نجات کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بزرگوں کی شفاعت خدا کے روبرو انہیں ہر سزا سے محفوظ کر دیگی یہ سب سے بڑی گمراہی ہے جو کوئی انسان اختیار کر سکتا ہے اور اسی کی بیخ کنی کے لیے سارے انبیاء اور صحف سماوی کا نزول ہوتا رہا ہے۔

یہ مثال تو کفار کی عبرت پذیری کے لیے تھی۔ اس کے بعد روئے خطاب مسلمانوں کی طرف پھرتا ہے اور دو مثالیں ان کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ پہلی مثال میں انھیں بتایا جاتا ہے کہ آخرت میں جس طرح کسی نبی یا ولی کا رشتہ کسی بدکردار شخص کو کیفر کردار تک پہنچنے سے بچا نہیں سکتا، اسی طرح کسی نیکوکار شخص کو کسی منکر حق کی قرابت داری بھی ہرگز ہرگز موجب ضرر نہیں ہو سکتی جبکہ وہ اس کی معصیت

پرستی اور اسکے کفر و انکار سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو۔ فرعون سے بڑا دشمن حق شاید ہی پیدا ہوا ہو، لیکن ایسے بڑے کافر کی بیوی بھی جب اللہ کی فرمانبردار بن گئی تو اس کا فرعون کی زوجیت میں ہونا اسکی نجات کی راہ میں بالکل حائل نہ ہوا۔ یہاں ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ پیغمبر کی بیوی اگر بدعمل ہے تو پیغمبر کے رشتۂ ازدواج میں ہونا اسکے لیے کچھ مفید نہیں۔ اور فرعون کی بیوی اگر نیکوکار ہے تو اتنے بڑے کافر و ظالم کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں وابستہ ہونا بھی اسکے لیے کچھ نقصان دہ نہیں۔ مومنوں کے ساتھ کفار کے رحمی رشتے مومنوں کی حیات اخروی کے لیے تو کسی گزند کے باعث نہیں ہوسکتے البتہ یہ ممکن ہے کہ دنیا کی زندگی میں انہیں کوئی نقصان پہنچ جائے اور جب اہلِ کفر پر خدا کا عذاب نازل ہو تو اس کی لپیٹ میں یہ صاحب ایمان بندے بھی آجائیں۔ اس لیے کہ خدا کی سنت ہی یہ ہے کہ جب بحیثیت مجموعی اس کی اطاعت سے بغاوت ہونے لگتی ہے اور عتاب الٰہی نمودار ہوجاتا ہے تو اس وقت عذاب کی وسعت محض کفار اور معاندین حق ہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ ان کے ساتھ رہنے والے جو دو چار صالح بندے ہوتے ہیں وہ بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔

دوسری مثال میں اسی حقیقت کو ایک تیسرے پہلو سے نمایاں کیا گیا ہے۔ پہلی مثال میں جس عورت کے انجام کو پیش کیا گیا تھا وہ ایسی عورت تھی جس کا تعلق ایک مرد صالح سے تھا۔ دوسری مثال میں جس عورت کا ذکر کیا گیا اس کا رشتہ ایک کافر و فاسق شخص سے تھا۔ اب تیسری عورت (حضرت مریم) کی مثال دی جاتی ہے جو مذکورۂ بالا دونوں رشتوں میں سے کوئی رشتہ نہیں رکھتی تھیں۔ ان تینوں اقسام کی عورتوں کے حالات و عواقب بیان کرنے میں دراصل ایک ہی مقصد پوشیدہ اور ایک ہی اصول جزا کا اظہار مطلوب ہے، یعنی یہ کہ ہر شخص اپنی شخصی ذمہ داری پر نجات یا عذاب کا سزاوار بنتا ہے۔ نہ کسی نیک آدمی کا رشتہ اسے آخرت کی سزاؤں سے بچا سکتا ہے جیسا کہ پہلی مثال میں مذکور ہے، نہ کسی بدکار کا رشتہ مادی کسی کی نجات اخروی میں حائل ہوسکتا ہے جیسا کہ دوسری

مثال بتا رہی ہے، اور نہ کسی شخص کی جزا و سزا پر اس کا کوئی رشتہ نہ رکھنا اثر انداز ہو سکتا ہے جیسا کہ تیسری مثال (حضرت مریم کی سرگذشت) شہادت دے رہی ہے۔

سورہ کے سیاق پر نظر ڈالنے سے ان امثال کے بعض نکات اور سامنے آتے ہیں۔ پہلے سے ازواج مطہرات کا ذکر چلا آ رہا ہے اور انھیں اپنی شخصی ذمہ داریاں یاد دلائی جا رہی ہیں۔ پھر اس سلسلے میں انھیں کے مثل دوسری عورتوں کے حالات پیش کر کے انھیں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اگر تم نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تو یاد رکھو رسول اللہ صلعم سے تمہارا انتساب آخرت میں کچھ کام نہ آئیگا جیسا کہ لوط اور نوح علیہما السلام کی ازواج کا معاملہ تمہارے سامنے ہے۔ چنانچہ اسی مناسبت سے ان امثال میں عام قرابت داریوں کا ذکر نہیں ہے بلکہ خاص نکاحی رشتوں ہی کا ذکر کیا گیا ہے

یحییٰ بن سلام کہتے ہیں کہ پہلی مثال حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کی تنبیہ اور تحذیر کے لیے بیان کی گئی ہے۔ پھر دوسری مثال کے ذریعہ انھیں سمع و طاعت پر ابھارا گیا ہے۔ تیسری مثال میں بھی، جو حضرت مریم سے متعلق ہے اور مومنوں کے لیے بیان کی گئی ہے، ایک اور نکتہ مضمر ہے۔ یعنی یہ کہ حضرت مریم پر یہودی اشرار نے جو جھوٹی تہمتیں تراشی تھیں انھوں نے اللہ کے نزدیک حضرت مریم کو کوئی ضرر نہیں پہنچایا بلکہ وہ اس کے ہاں ویسی ہی برگزیدہ رہیں جیسا کہ واقعتہً وہ تھیں اور انھیں اللہ تعالیٰ نے تمام صنف نازک پر فضیلت بخش کر صدیقہ کا مرتبہ جلیلہ عطا فرمایا۔ پس اس مثال سے معلوم ہوا کہ فاسق و فاجر لوگوں کا کسی نیکوکار کو متہم کرنا خدا کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اس پہلو سے گویا یہ مثال حضرت عائشہ صدیقہؓ کے لیے موجب تسکین و تسلی بھی ہے، اگر یہ سورہ واقعہ افک کے بعد نازل ہوئی ہو، جیسا کہ صحیح روایات سے ثابت ہوتا ہے۔

رسائل ومسائل

ایک غلط فہمی کا ازالہ

از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز

ربیع الاول کے ترجمان القرآن میں "اسلامی معاشرت" پر تبصرہ نظر سے گذرا۔ تبصرہ نگار کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار آزادانہ کرے۔ لیکن تبصرہ زیر نظر میں ایک ایسی چیز بیان کی گئی ہے جو، کم از کم میرے نزدیک، غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس سے چونکہ بلاوجہ ایک شبہ پیدا ہو جانے کا امکان ہے اس لیے میں اس کا ازالہ ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نے "اسلامی معاشرت" میں ان پیشوایانِ مذاہب کے متعلق جو بعثت نبی اکرمؐ سے پہلے گذر چکے ہیں، لکھا ہے کہ چونکہ قرآن کریم اس پر شاہد ہے کہ دنیا کی ہر قوم میں رسول آتے رہے ہیں اس لئے مسلمانوں کو انکی تعظیم کرنی چاہیئے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کسی قوم کا بانیٔ مذہب اُنہی رسولوں میں سے ہو جن کا تفصیلی ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا۔ محترم تبصرہ نگار نے اس سے یہ خطرہ ظاہر کیا ہے کہ اس سے ان پیشوایانِ مذہب کے متعلق بھی جو حضورؐ کے بعد ہوئے ہیں یہی تخیل قایم کیا جائیگا اور اس اعتبار سے گرونانک اور مرزا صاحب کو بھی رسول ماننا پڑیگا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی اصل عبارت نقل کر دوں تاکہ اس سے معلوم ہو سکے کہ محترم تبصرہ نگار کا یہ اشتباہ صحیح ہے یا نہیں۔ میں نے لکھا ہے کہ:-

غیر مسلموں کے بزرگوں کی تعظیم کرو

اُس عنوان کو بخوبی سمجھنے کے لیے ایک اصولی بات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ

ہے کہ اسلام دنیا میں کوئی نیا مذہب نہیں بلکہ جس وقت سے انسانوں کو سچائی اور صداقت کی ضرورت لاحق ہوئی ہے اُسی وقت سے خدا کی طرف سے اس کا سچا پیغام مختلف زمانوں میں، مختلف اقوام عالم کے اندر، مختلف ممالک میں، اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کی معرفت دنیا تک آتا رہا۔ اس پیغام کا نام اسلام ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا۔ اور ہم نے ہر ایک قوم میں رسول بھیجے۔

"لیکن جو پیغام یہ رسول لاتے رہے لوگوں نے اس کو محفوظ نہ رکھا۔ کہیں تو وہ حوادث ارضی و سماوی سے محو ہو گیا۔ کہیں انسانی ہاتھوں نے اس میں آمیزش کر دی۔ کہیں اسے بھلا ہی دیا گیا۔ یہی کچھ ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ خدا کا وہی پیغام ایک آخری اور مکمل ایڈیشن کی شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہو گیا اور اسکے لیے ایسا انتظام کر دیا گیا کہ یہ قیامت تک نہ مٹ سکتا ہے نہ بھلایا جا سکتا ہے نہ اس میں کوئی ملاوٹ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ تاریخ جہاں یہ گواہی دیتی ہے کہ کوئی قوم یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اسکے پاس یقینی طور پر وہی کتاب موجود ہے جو ان کے رسول نے دی تھی وہاں تاریخ اس بات پر بھی شاہد ہے کہ قرآن کریم یقینی طور پر حرف بحرف وہی ہے جو رسولِ اکرمؐ نے مسلمانوں کو دیا تھا۔ اس لیے اب اصلی اسلام قرآنِ کریم میں ہی ہے لیکن قرآنِ کریم پر ایمان لانے والے کے لیے یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ سب سے پہلے اس بات کا اقرار کرے کہ محمد رسول اللہ صلعم سے پیشتر جسقدر رسول گذرے ہیں وہ سب خدا کی طرف سے سچے رسول تھے اور ان تمام کی صداقت اور منجانب اللہ (خدا کی طرف سے) ہونے پر ایمان لانا مسلمان ہونے کی پہلی شرط ہے .... اب ان رسولوں میں بعض کے نام تو قرآن کریم میں درج ہیں ــــ ایسے رسولوں کے جنکی قوموں کے حالات اور واقعات سے قرآن کے اُس وقت کے مخاطب لوگ عبرت حاصل کر سکتے تھے ــــ لیکن باقیوں کے متعلق فرمایا کہ :-

"وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ۔

"ایسے رسول بھی جن کا ذکر اس سے پیشتر کیا جا چکا ہے اور ایسے بھی کہ جن کا ذکر نہیں کیا گیا۔
"اب جس وقت ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ ہر قوم میں خدا کے رسول آتے رہے ہیں اور تمام رسولوں پر ایمان لانا ہم پر فرض قرار دیا گیا ہے ۔ تو جو قوم بھی اپنے کسی بزرگ کے متعلق کہے کہ وہ خدا کا رسول تھا، ایشور کا بھگت تھا، ہمیں اس کے سامنے تعظیم کے لیے اپنا دل جھکا دینا چاہیے کہ ممکن ہے یہ انہی رسولوں میں سے ہوں جنکی صداقت پر ہم ایمان لانے پر مجبور ہیں ۔ انکی تعلیم یا ان کے حالات اگر قرآن کریم کے معیار پر درست ثابت نہ ہوں تو یہ سمجھ لینا پڑیگا کہ بعد میں آنے والوں نے ان میں رنگ آمیزی کر دی ہے ۔ ان بزرگوں کی تعظیم پر تو ایک مسلمان ازروئے قرآن مجبور ہو جائیگا۔
"اب فرمائیے کہ جس قرآن کی یہ تعلیم ہو اسکے متعلق کبھی وہم و گمان بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دوسری قوموں کے بزرگوں کے خلاف کسی سوء ادبی یا گستاخی کا خیال بھی پیدا ہونے دیگا ؟ کبھی نہیں !"

(اسلامی معاشرت ص ۵۰۰-۵۰۱ ۔ ایڈیشن اول)

اس تحریر میں یہ بات صاف طور پر موجود ہے کہ یہاں وہی رسول مراد ہیں جو نبی اکرمؐ سے "پیشتر" گذر چکے ہیں ۔ جن میں سے بعض کے نام قرآن کریم میں درج ہیں، اور اکثر کے نہیں ۔ لہٰذا نبی اکرمؐ کے بعد آنے والے پیشوایانِ مذاہب کا اس سے کچھ واسطہ نہیں ۔ حضورؐ کے بعد جب کوئی نبی آہی نہیں سکتا تو اسکے متعلق کسی امکان کی کیا گنجائش ؟ حضورؐ کے بعد ہر مدعی نبوت، خواہ وہ مسلمانوں میں سے ہو یا غیر مسلموں میں سے، کاذب ہے ۔

نبی اکرمؐ سے پیشتر کے پیشوایانِ مذاہب کے متعلق البتہ دو صورتیں ہو سکتی ہیں ۔

(۱) یا تو وہ سچا نبی ہو گا ۔ اور یا (۲) اس نے جھوٹا دعوائے نبوت کیا ہو گا ۔

چونکہ یہ بات حتمی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ فلاں بانی مذہب فی الواقع جھوٹا تھا اس لیے حسن ظن کی بنا پر اگر اسکی بھی تعظیم کردی جائے تو اس میں کیا مضائقہ ہے - میرے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں کہ "ممکن ہے یہ انہی رسولوں میں سے ہو جنکی صداقت پر ہم ایمان لانے پر مجبور ہیں"

میرا خیال ہے کہ اس چیز سے نہ تو "بوئے مداہنت" آتی ہے اور نہ ہی اس سے یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ ہمیں حضورؐ کے بعد کے بانیانِ مذاہب کے دعوائے نبوت کی بھی تصدیق کرنی پڑیگی - چونکہ تبصرہ محولہ بالا سے ایک ایسی غلط فہمی کا امکان ہے جو میرے حیطۂ تصور میں بھی نہ تھی اس لیے میں شکرگذار ہونگا اگر آپ اس عریضہ کو ترجمان القرآن میں شائع فرمادینگے - اور یوں تو میں بھی ایک انسان ہوں جس سے ہر وقت غلطی کا امکان ہے - وما توفیقی الا باللہ -

---

مسئلہ قومیت

تالیف سید ابوالاعلیٰ مودودی

مطبوعات

ہمارا قومی نصب العین کیا ہونا چاہیے تالیف خان فضل کریم خانصاحب درانی - بی - اے - ضخامت ۹۶ صفحات قیمت ۱۲ - ملنے کا پتہ :- حلیم بک ڈپو ۳۷ سانکلی اسٹریٹ - بائیکلا - بمبئی ۸ -

ہمارے علمی اور سیاسی حلقوں میں فاضل مصنف اچھی طرح متعارف ہیں - انھوں نے اپنی اس کتاب میں ہندی مسلمانوں کے نصب العین سے بحث کی ہے - پہلے تو انھوں نے ہندوستان کی تاریخی اور جغرافی تقادیر کی روشنی میں یہ تبایا ہے کہ ہمارے لیے پاکستان، سلطنت اندر سلطنت اور تہذیبی منطقوں والی تمام اسکیمیں مضر اور ناقابلِ قبول ہیں - پھر انھوں نے ہندوؤں کی ذہنی کیفیت کا تیزان کی تمدنی اور معاشرتی خصوصیات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملا کر متحدہ قومیت بنانے کا تصور تو درکنار ان دونوں قوموں کی تہذیبی فطرتوں میں ایسا بعد المشرقین ہے کہ سرے سے کسی طرح کا اتحاد ممکن ہی نہیں اور جو مسلمان زعما اپنی قوتوں کو اس شئے نایافتنی کے حصول میں خرچ کر رہے ہیں وہ گویا قضائے مبرم سے لڑ رہے ہیں، اور ان کا یہ کہنا کہ مسلمان بغیر ہندو کا سہارا لیے آزادی کی نعمت کسی طرح حاصل نہیں کر سکتے، انتہائی بزدلی، دوں ہمتی اور حقیقت ناشناسی پر دلالت کرتا ہے - آخر میں انھوں نے تبایا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اس وقت ایک اور صرف ایک نصب العین ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ سارے ہندوستان پر بلا شرکت غیرے اپنی حکومت قائم کریں - خود اسی میں اس پورے ملک کی آزادی کا راز مضمر ہے۔ اس نصب العین کے حصول کے لیے انھوں نے اپنا پروگرام بھی تحریر فرمایا ہے اور اس امر پر خاص طور

پر زور دیا ہے کہ مسلمانوں میں احساس خودی پیدا کیا جائے ۔

ہم موصوف کے اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ آنحضرت صلعم نے مدینہ میں یہودیوں کو ملا کر مخلوط قومیت کی تعمیر کا تجربہ کیا تھا ۔ معاہدہ کے بعض الفاظ سے یہ دھوکہ ضرور ہوتا ہے لیکن دراصل یہ محض لفظی اشتراک ہے ورنہ زمانہ حال کی قومیت کے مفہوم کو اس تصور سے دور کا بھی واسطہ نہیں جس کے تحت آنحضرت صلعم نے یہودیوں سے تحالف کیا تھا ۔ یہ تحالف قومیت اور ملیت کا اتحاد نہ تھا بلکہ دو قوموں اور ملتوں کا ایک مشترک دشمن کے مقابلہ میں دفاعی معاہدہ تھا اور بس ۔

مولف موصوف کو "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ تحریک "دارالاسلام" کے اصول و مقاصد اور اس کے نصب العین کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے ۔ اس وقت انھیں اندازہ ہوگا کہ ہمارا مطمح نظر موصوف کے پیش کردہ نصب العین سے پست نہیں، بلند ہی ہے ۔ ان کے اسلوب تحریر سے صاف طور پر مترشح ہوتا ہے کہ وہ ابھی تک ہندوستان میں "مسلمانوں" کی حکومت قائم کرنے کے تخیل سے آگے نہیں بڑھے ہیں، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انھوں نے خاکسار تحریک کو موجودہ تحریکات سیاسیہ میں سب سے غنیمت اور قابلِ قبول قرار دیا ہے ۔ بخلاف اسکے دارالاسلام کی تحریک کا مقصد "مسلمانوں کی حکومت" نہیں بلکہ قرآن یا اسلام کی حکومت یعنی خلافت الٰہی کا قیام ہے ۔ و شتان ما بینہما ۔

اس میں شک نہیں کہ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" میں جو نصب العین پیش کیا گیا ہے وہ اس سے فروتر ہے ۔ لیکن یہ دراصل اپنے اندر ایک خاص مصلحت اور حکمت رکھتا ہے ۔ مریض کو اگر اس کی قوت سے زیادہ قوی دوا دیدیجیے تو وہ اگر فی نفسہٖ تریاق بھی ہوگی تو زہر بن جائیگی ۔ ہندی مسلمان کی ذہنی فرومایگی کا لحاظ کیے بغیر اس کے سامنے کوئی نصب العین رکھنا ہمارے خیال میں خلافِ دانش ہے ۔ اس لیے سردست جمہور مسلمین کے سامنے تو ہم وہی نصب العین رکھنے پر مجبور

ہیں۔ہاں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نگاہ بلند اور فکر عزیمت آزما پہلے سے دے رکھی ہے، ان کے لیے دارالاسلام کی تحریک موجود ہے۔ جب عوام الناس اپنے مقصود کی پہلی منزل طے کرلیں گے اس وقت وہ بھی خود بخود اسی مرکز پر آجائیں گے۔

رہ گیا مسلمانوں کے بنیادی مرض کی تشخیص اور اس کے واقعی علاج کے متعلق موصوف کا ریمارک، سو ہمارے خیال میں ان کا اختلاف نزاع لفظی سے زیادہ نہیں۔ جس چیز کو وہ احساس خودی کے نام سے پکارتے ہیں، اگر اس احساس خودی سے مراد اسلامی احساس خودی ہے تو یقیناً اس کے حصول کا اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ ہے ہی نہیں کہ عام مسلمانوں میں صحیح اسلامی روح اور قرآنی تعلیمات کی اشاعت کی جائے۔ اور انہیں بتایا جائے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں اور اسلام کیا چاہتا ہے؟ اور اگر اس احساس خودی سے مراد وہ "قومی خودی" کا احساس ہے جو ہٹلر اور مسولینی میں پایا جاتا ہے تو بلا شک و ریب اسکو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔

فاضل مصنف کا انداز بیان بہت ہی شگفتہ اور دلآویز ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بعض مقامات پر ان کا قلم جھنجلا کر نہایت درشت لب و لہجہ اختیار کرلیتا ہے۔

ہم اپنے ناظرین کو مشورہ دیں گے کہ وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔ کتاب ہر حیثیت سے قابلِ قدر اور مفید ہے۔

قرآن پاک اور ہماری سیاست تالیف غلام مصطفےٰ صاحب سکریٹری مسلم لیگ (موڑہ تالاب ضلع پٹنہ) گذشتہ دنوں مولانا ابوالکلام آزاد نے کانگریس کی حمایت میں مسلمانوں کو ایک پیام دیا تھا۔ اس مختصر سے پمفلٹ میں مولف نے مولانا کے خیالات اور ان کے استدلالات کی تضعیف کی ہے اور مسلمانوں کو قرآن کی طرف رجوع کرنے کی رغبت دلائی ہے۔ آخر میں کسی نامعلوم الاسم مسلمان کا "تصدیق خیالات از یک مسلم" کے عنوان سے ایک مضمون ہے۔ جس میں اسی مدعا کی

مزید تشریح اور مسلم لیگ کی حمایت کی گئی ہے - ۲ر کے ٹکٹ بھیج کر مذکورہ بالا پتہ سے مل سکتا ہے -

تابعین | تالیف شاہ معین الدین احمدؐ صاحب ندوی - ضخامت ۵۳۸ صفحات - قیمت درج نہیں -

ملنے کا پتہ :- دار المصنفین، اعظم گڈھ -

یہ کتاب ۱۹۶ اکابر تابعین کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے - مولف موصوف نے مستند تاریخی ماٰخذ سے پوری چھان بین کے ساتھ یہ مرقع سیر قلم بند فرمایا ہے اور قریب قریب ہر واقعہ اور جزئیہ کو بیان کرکے اس کے ماخذ کا حوالہ بھی دیدیا ہے - یوں تو تابعین کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے اور ان میں صدہا اپنے وقت کے مشاہیر میں تھے لیکن یہ کتاب چونکہ محض اسلامی بصیرت سے مسلمانوں کو روشناس کرنے کے لیئے لکھی گئی ہے اس لیے صرف انھیں بزرگوں کے سوانح حیات تک اسکا دائرہ محدود ہے جو بحیثیت ایک نمائندہ اسلامیت کے اپنے اندر کوئی اسوہ رکھتے ہیں -

کتاب کے شروع میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شروانی کا ایک مختصر مقدمہ ہے جس میں موصوف نے کتاب کی بعض واقعی اور اہم فروگذاشتوں کی طرف اشارہ کردیا ہے -

سیرتِ بتول | تالیف مولانا اعجاز الحق صاحب قدوسی - ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت ۶ر

ملنے کا پتہ :- سلیم اختر صاحب قدوسی، نامپلی جدید، مکان ۱۱/۱۷ لال ٹیکری - حیدرآباد - دکن -

مولف کو تاریخ و سیرت کے فن سے ایک خاص دلچسپی ہے - وہ مسلمان بچیوں اور عورتوں کے پڑھنے کے لیے اکابر اسلام کی سیرتیں لکھنے کی مسلسل خدمت انجام دے رہے ہیں - کتاب زیر تبصرہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں جگر گوشۂ رسول فاطمہ بتول رضی اللہ عنہا کے حالات و اخلاق نہایت صاف اور شستہ زبان میں اختصار کے ساتھ جمع فرمائے ہیں - ہر مسلمان بچی کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا اور سیدۃ النساء کے اسوۂ مبارک کو سامنے رکھنا چاہیئے تاکہ اسے معلوم ہو کہ مسلمان بچی، مسلمان بیوی اور مسلمان ماں کیسی ہوتی ہے -

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار۔ دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصّہ ہے۔

۵- قوانین جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دوسرے مذاہب میں۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید۔ بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ۔ قیمت مجلد ۵ غیر مجلد للعہ

رسالہ دینیات یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اِس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصول شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اِس رسالہ کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں نیز علما بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰ ا محصولڈاک ۲ خرچ وی پی ۳

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

سوہنی و تصاویر پرنٹنگ پریس ٹبی، ہوا ہے میں چھپ ہوئی